دسمبر ۱۹۷۱ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

۱۹۷۲ء کی منفرد ڈائری

لیل و نہار

- اِسلامی تاریخ کے اہم واقعات۔
- دنیائے اِسلام کے متعلق نادر معلومات۔
- تاریخ، آیات، احادیث اور اشعار سے مزیّن۔
- ہر وقت کے لیے مسنون دعاؤں کا مجموعہ۔
- احباب کے لیے نفیس ترین تحفہ، جس کا پیش کرنا باعثِ فخر

بڑا سائز ۲۳×۱۸/۸ ۸ روپے —— چھوٹا سائز ۲۷×۱۷/۱۶ ۵ روپے

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (مغربی پاکستان)

شاخ: ۱۶۔ بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۶	دسمبر ۱۹۷۱ء مطابق شوال المکرم ۱۳۹۱ھ	عدد ۴

— مغربی پاکستان —		— مشرقی پاکستان —
چندہ سالانہ: آٹھ روپے	ماہنامہ ترجمان القرآن	سالانہ (ہوائی ڈاک) ۱۰ روپے
فی پرچہ: ۸۰ پیسے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور	فی پرچہ (") ۹۰ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اشتراکیت کے جس خطرے کی طرف ہم نے گذشتہ اشاعت میں اشارہ کیا تھا افسوس ہے کہ وہ خطرہ نہ صرف زیادہ قریب آ رہا ہے بلکہ شدت بھی اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ اُس کی آمد سے پہلے جو نشانیاں بالعموم ظاہر ہوتی ہیں یا بربادی کی جن نشانیوں کے جلو میں یہ آتا ہے وہ زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہیں اور یوں احساس ہوتا ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ نے دستِ غیب سے اس کے روکنے کے انتظامات نہ کیے تو یہ مقدس سرزمین سرخ فوج سے تاخت و تاراج ہوگی اور یہاں بھی اسلام اور مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا جو سمرقند، بخارا، اور تاشقند یا دوسرے اشتراکی ممالک میں ہو چکا ہے۔

خطرے کی پہلی علامت ملک کا اقتصادی بُحران اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ہر آن بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور ضروریاتِ زندگی کی کمیابی ہے۔ یُوں تو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہی معاشی حالات دن بدن خراب ہونے شروع ہوتے اور انہوں نے کسی منزل پر بھی بحالی کی طرف کروٹ نہیں لی لیکن خاص طور پر گذشتہ تین سالوں سے انہوں نے بڑی تشویشناک صورت اختیار کر رکھی ہے۔ ۱۹۶۸ء کا قریب قریب پورا سال اور ۱۹۶۹ء کا کچھ حصہ فیلڈ مارشل ایوب خاں کی آمریت سے نجات حاصل کرنے میں صرف ہو گیا۔ اور اس پورے عرصہ میں ملک میں غیر یقینی حالات کی وجہ سے تجارت اور صنعت و حرفت کو غیر معمولی نقصان پہنچا۔ ان حالات میں جبکہ جمہوریت کی صبح طلوع ہوا چاہتی تھی، چند ایک غیر ذمّہ دار سیاست دانوں کی عاقبت نا اندیشی اور بے جا ضد کی وجہ سے ملک پھر مارشل لا کی زد میں آ گیا۔ چند ماہ خوف و ہراس میں گذر گئے اور سرمایہ دار طبقہ مستقبل کے اندیشوں کی وجہ سے سرمایہ لگانے میں متامل رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرمایہ کاری کا دائرہ مسلسل سکڑنے لگا اور ملک پر معاشی بدحالی اور

بیروزگاری کے مہیب سائے چھانے لگے۔ اس بحران نے جرائم اور دوسری معاشرتی بُرائیوں میں اضافہ کیا۔ رشوت ستانی کا بازار گرم ہُوا۔ عوام کے اندر اپنے مستقبل کے بارے میں بددلی پھیلی خصوصًا نوجوان طبقہ بیروزگاری کی وجہ سے سخت پریشانی کا شکار رہا اور اس کے اندر معاشرے سے بغاوت کے رجحانات بڑی تیزی کے ساتھ اُبھرے لگے۔

سرمایہ کاری میں کمی کی وجہ سے ملک کی پیداوار میں تشویشناک کمی ہوئی جس سے حکومت کی آمدنی بھی کم ہوگئی اور امورِ مملکت کو چلانے کے لیے وہ محصولات کی شرح میں اضافہ اور افراطِ زر کی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور ہوئی اب اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف تو پیداوار میں کمی کی وجہ سے آمدنی کے ذرائع کم ہوتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف محصولات میں اضافہ کی وجہ سے بنیادی ضروریات کی قیمتیں بھی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ متوسط اور غریب طبقوں کی کمر ٹوٹ گئی ہے، ان کے لیے آرام اور سکون سے زندگی بسر کرنا تو ایک طرف رہا جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنا دوبھر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اندوہناک معاشی حالات آنے والے خطرے کی دہائی دے رہے ہیں۔

سیاسی حالات معاشی حالات سے بھی دگرگوں ہیں۔ عوام کے اندر سیاسی اعتبار سے اس وقت طمانیتِ قلب پیدا ہوتی ہے جب انہیں اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ وہ دھونس، دھاندلی کے بغیر اپنی اپنے لیے کو ملک کی حکمران قوت بنانے پر قادر ہیں لیکن اگر اس کے برعکس وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اُن کی حیثیت بھیڑ بکریوں کی سی ہے جنہیں شورش پسند قوتیں اپنی مرضی سے جس طرف چاہیں ہانک کر لے جا سکتی ہیں اور اُن کے وجود کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ ان کا ریلا طالع آزماؤں اور اقتدار کے حریصوں کو بہا کر مسندِ اقتدار سے ہمکنار کر دے تو اُن کے اندر شدید محرومی کا احساس اُبھرتا ہے۔ اور یہ وہ احساس ہے جس سے فسطائیت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ انسان کے دل میں جب یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اُسے بہرطور غلام ہی رہنا ہے اور اس کی قسمت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں تو پھر اُسے ملک کی قسمت سے بھی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ وہ پھر

اپنی بلا سے بُوم بسے یا ہُما رہے

کے سے مُردہ احساسات کے ساتھ سیاسی تبدیلیوں کو ایک غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ فسطائی رُجحانات رکھنے والے لوگوں کے لیے ایسے حالات بڑے سازگار ہوتے ہیں اور وُہ قوت کا مظاہرہ کر کے اس طرح کے نیم جان لوگوں کی گردنوں پر بڑی آسانی سے مُسلط ہو جاتے ہیں۔

سیاسی حالات کی اِس سازگاری کے ساتھ ساتھ فسطائیت کو نا اہل انتظامیہ بھی بڑی قوت بہم پہنچاتی ہے۔ اور جو راستہ اسے برسوں میں طے کرنا ہوتا ہے۔ وہ اس کی مدد سے مہینوں نہیں بلکہ ہفتوں میں طے کر لیتی ہے۔ بدقماش، نوکر شاہی کا وجود فسطائی انقلاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے جس معاشرے میں عوام کو ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہیں، جس میں ان کی عزت اور آبرو کے تحفظ کا کوئی معقول انتظام نہ ہو، جس میں انہیں اپنے جائز حقوق کے حاصل کرنے کے لیے بھی رشوت دینی پڑے جس میں غنڈے اور بدکردار لوگ بالکل بے خوف ہو کر لوگوں پر دستِ ظلم دراز کرتے رہیں، جس میں معصوم بچوں اور بے بس عورتوں کا اغوا ڈاکہ زنی اور معمولی معمولی بات پر قتل و غارت زندگی کے معمولات بن جائیں اور ان کی روک تھام کی کوئی سبیل نظر نہ آتی ہو۔ وہاں عوام کو امُورِ مملکت سے آخر کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے اپنی آزادی تک کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان بگڑے ہوئے حالات میں جب اُنہیں یہ بات سُجھائی جاتی ہے کہ آمریت کی بے رحم جکڑبندیاں ہی ان سماج دشمن عناصر کو مذموم سرگرمیوں سے باز رکھ سکتی ہیں تو وہ ان جکڑبندیوں کو عافیت کا حصار سمجھتے ہوئے ان کے تحت رہنا گوارا کر لیتے ہیں۔

اشتراکی انقلاب کی آمد کی ایک بڑی علامت عوام کے جذبات میں اشتعال اور سیاسی رہنماؤں کی اشتعال انگیزیاں ہیں۔ جو لوگ اشتراکی انقلاب کا داعیہ لے کر اُٹھتے ہیں وہ چونکہ اس امر سے واقف ہوتے ہیں کہ یہ انقلاب غیر فطری ہے اور اس میں معمولی سی اقلیت کو اکثریت پر مُسلط کرنا مقصود ہوتا ہے اس لیے جب تک عوام کی غور و فکر کی صلاحیتوں کو بالکل مفلوج نہ کر دیا جائے۔ اس وقت تک یہ انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اشتراکی رہنما بیک وقت چار قسم کی چالیں چلتے ہیں۔ ان کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ملک کے اندر جو فرد یا گروہ بھی کسی احترام کا مستحق ہو سکتا ہے۔ یا لوگ اس کی بات سننا

گوارا کر سکتے ہیں۔ اُسے نہایت ذلیل ہتھکنڈوں کے ساتھ معاشرے میں بدنام کیا جائے۔ اور تقریروں، تحریروں اور بیانات سے اس کا اس طرح استخفاف کیا جائے کہ عوام اس کی بات سُننا تو کجا اس کے وجود سے نفرت کرنے لگیں۔ اُسے ملک و ملت کا غدار، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ایجنٹ، عوام کا دشمن، عوامی مفادات کا مخالف، غیر ملکی طاقتوں کا آلۂ کار، اقتدار کا حریص، طالع آزما اور خائن کی حیثیت سے پیش کیا جائے تاکہ اس کا بیشتر وقت اور صلاحیتوں کا بیشتر حصہ اپنے دفاع میں صرف ہوتا رہے اور اشتراکی زعما اس پر تابڑ توڑ حملے کر کے اُسے سنبھلنے اور کسی تعمیری کام کی طرف دل جمعی کے ساتھ متوجہ ہونے کا موقع نہ دیں۔ اشتراکی انقلاب کے بارے میں یہ بات بطورِ اصول سمجھ لینی چاہیے کہ یہ انقلاب ایسے حالات میں آتا ہے جب ملک عظیم شخصیتوں کے وجود سے بالکل خالی ہو چکا ہو۔ یا خالی کر دیا گیا ہو یا کم از کم عوام کو یہ باور کرا یا جا چکا ہو کہ یہ ملک باعظمت، ایماندار اور ملک و ملت کے خیر خواہوں کے وجود سے یکسر خالی ہو چکا ہے اور اس میں لے دے کر اب ایک ہی شخصیت باقی رہ گئی ہے جو ساری انسانی خوبیوں کا مرقع اور قائدانہ صلاحیتوں کا پیکر ہونے کی وجہ سے قوم کی بگڑی بنانے پر تنہا قادر ہے۔ اس کی ذات کے علاوہ باقی سب نا اہل اور وطن دشمن اور ملک و ملت کی محبت سے عاری ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اشتراکیت کے علمبردار ملک کی باوقار اور بلند شخصیتوں کو گرانے میں پوری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ یہ اشتراکی پروگرام کا ایک ضروری حصہ ہے جس کا مقصد ملک کو قیادت کے اعتبار سے ویرانہ بنانا ہوتا ہے تاکہ اس کی پہنائیوں میں ایک آواز کی گونج کے علاوہ کسی دوسری آواز کی گونج سنائی نہ دینے پائے اور لوگ صرف اسی آواز کے پیچھے دیوانوں کی طرح چلتے رہیں۔

اس پروگرام کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ لوگ فکری اعتبار سے یا تو بالکل تہی دامن ہو جائیں تاکہ ان کے پلّے اشتراکی نظریات کو بڑی آسانی کے ساتھ باندھا جا سکے یا ان کے افکار و نظریات میں اس قدر انتشار پیدا ہو جائے کہ وہ گھبرا کر ان سے دامن کش ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی انقلاب ایسے معاشرے میں آتا ہے جہاں افکار کے نخل یا تو بالکل ٹھنٹھ ہوں یا ان کی آب و تاب بالکل مسلوب ہو چکی ہو تاکہ آکاس بیل کی بے رونقی عوام پر واضح نہ ہو سکے۔ مارکس کے نظریے کے مطابق اس انقلاب کو

سب سے پہلے برطانیہ اور فرانس جیسے صنعتی ممالک میں آنا چاہیے تھا۔ کیونکہ ان میں طبقاتی منافرت زرعی ممالک کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتی ہے مگر یہ انقلاب مارکس کی سائنٹفک پیش گوئی، جو اس کے تاریخی عمل کے طویل مشاہدے اور مطالعہ کا نتیجہ تھی اور جسے اشتراکی تاریخ کی اضطراری چال سمجھ کر ناگزیر عمل قرار دیتے ہیں، روس جیسے زرعی ملک میں برپا ہوگیا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ روس کے بعض حصے فکری اعتبار سے بالکل لق ودق صحرا کا نقشہ پیش کرتے تھے اور بعض حصے پریشان فکری کا شکار تھے اور یہ ماحول اشتراکیت کو بڑا راس آتا ہے۔

اشتراکی انقلاب تاریخ کے سائنٹفک عمل کے مطابق برطانیہ اور فرانس میں اس لیے برپا نہ ہوسکا کہ یہ ممالک نہ تو قیادت کے اعتبار سے چٹیل میدان تھے اور نہ افکار و نظریات کے لحاظ سے ویرانے تھے۔ یہاں سیاسی مدبرین، بلند پایہ مفکرین کی ایک ٹیم موجود تھی جو آزادی کے ساتھ مختلف مسائل کے بارے میں سوچتی اور رائے زنی کرتی اور ہر معاملے کے حسن و قبح پر پوری طرح غور کرکے اپنے خیالات عوام میں پھیلاتی تاکہ ان کے اندر مسائل کو سمجھنے اور فیصلے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اور وہ کسی چیز کو نہ تو اندھے جوش میں قبول کریں اور نہ جھوٹے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر مسترد کردیں۔ جس قوم کے اندر غور و فکر کی آزادی ہو اور جسے ہر بات ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچنے کا سلیقہ آتا ہو اس میں اشتراکیت کبھی راہ نہیں پاسکتی۔

تاریخ کا یہ ایک المیہ ہے کہ بعض بے عقل لوگوں نے اشتراکیت کے مزاج کو جانے بغیر اُسے ان ممالک میں مسلط کرنے کی کوشش کی جو فکری اعتبار سے بڑے شاداب تھے اور جن کی شادابیوں کی داستانیں انسانی کمالات کے زریں کارناموں کی حیثیت سے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان ممالک میں جب چند سرپھروں نے اس قسم کی احمقانہ جدوجہد کی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کے اندر ایک خوفناک کشمکش شروع ہوگئی جس نے اسے تباہ کرکے رکھ دیا۔ مشرقِ اوسط خصوصاً مصر اور شام اس قسم کی غیر عاقلانہ اور غیر حقیقت پسندانہ کوششوں کے بڑے بھیانک مناظر پیش کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے بعض اہم حقائق اور تاریخ کے بعض اہم فیصلوں کو نظر انداز کرتے ہوتے اور مطلق العنان فرمانروا اور کسی بہت بڑے انقلاب کا

ہیر و بلنے کے لیے یہ سوچنا تک گوارا نہ کیا کہ کیا ان ممالک کی ذہنی فضا اشتراکیت کے لیے موزوں بھی ہو سکتی ہے ؟ اگر یہ انقلاب برطانیہ اور فرانس جیسے ممالک میں نہیں آسکتا جن کا پورا فکری ماحول مادّیت سے عبارت ہے اور جس کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچے مادّیت پر استوار ہیں تو یہ انقلاب آخر ان ممالک میں کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے جن کا نہ صرف ذہنی اور فکری پس منظر بلکہ اجتماعی زندگی کے سارے ڈھانچے اخلاق اور روحانیت کی اساس پر قائم ہوں اور ان میں زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کی پوری قوت بھی موجود ہو۔ جو شخص بھی اشتراکیت کے مزاج سے واقف ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ فرق جو کچھ ہے وہ منزل کا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کو اگر عملی میدان میں مادّیت اور الحاد کا پہلا قدم قرار دیا جائے تو اشتراکیت اس کا دوسرا قدم ہے جو اُسی سمت اٹھتا ہے جس سمت کہ کسی قوم کو الحاد دھکیل کر لیے جاتا ہے ایک مفکر نے یہ کہا ہے کہ جس چیز کو سرمایہ داری پرچون کے بھاؤ بیچتی ہے اشتراکیت اُسے تھوک کے بھاؤ فروخت کرتی ہے۔ اشتراکیت درحقیقت سرمایہ داری کے دائرے کو وسعت اور اس کے تسلّط کو زیادہ مضبوط اور ہمہ گیر بنانے کا ظالمانہ پروگرام ہے۔ فکر و عمل کے میدان میں اس یکجائی کے باوجود اگر اشتراکیت ان سرمایہ دارانہ ممالک میں کامیاب نہیں ہو سکی جن کے عوام ذہنی لحاظ سے بیدار ہیں تو اس کی کامیابی کے ان ممالک میں کیا امکانات ہو سکتے ہیں۔ جن کے باشندوں کے فکر و عمل کے محرکات الحاد اور مادّیت سے بالکل جُدا گانہ ہیں۔ جن مسلم ممالک میں بھی اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے اشتراکیت کو ٹھونسنے کی کوشش کی گئی وہاں سوائے کشت و خون کے کوئی دوسرا نتیجہ برآمد نہیں ہُوا۔

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اشتراکی تحریک درحقیقت یاس و قنوطیت کی پیداوار ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے جن معاشی، اخلاقی اور معاشرتی برائیوں کو جنم دیا ہے ان کی اصلاح کے لیے یہ نظام چونکہ بالکل عاجز ہے اور اصلاح کی جو تدبیر بھی اختیار کی جاتی ہے وہ ہزاروں دوسری بُرائیوں کو جنم دیتی ہے۔ اس لیے قنوطیت کے شکار بعض مفکّرین نے انسانی فلاح کے لیے یہ راستہ تجویز کیا کہ انسان کو بھرے ہوئے حیوان کی سطح پر رکھ کر اس سے معاملہ کیا جائے۔ اس تصوّر کو

انسان کے بارے میں مسیحی نقطۂ نظر کہ وہ پیدائشی گنہگار ہے، سے بھی تقویت حاصل ہوئی اور انسان کے بارے میں غلطی سے یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ اس پر جب بھی اعتماد کیا جائے گا تو وہ اس اعتماد کا نا اہل ثابت ہوگا، اُسے جب بھی آزادی ملے گی تو وہ اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا، اُسے جب بھی اختیارات حاصل ہوں گے تو وہ ان اختیارات کو غلط استعمال کرے گا اور اس کے ہاتھ میں جب بھی دولت آئے گی تو وہ لازمی طور پر اُسے غلط راستوں پر خرچ کرے گا۔ اس لیے انسانی فلاح کی صرف ایک صورت ہے کہ اُسے حیوانوں کی طرح جکڑ کر رکھا جائے اور نپے تلے چارے پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ یہ نقطۂ نظر نہ صرف انسانیت کی تذلیل ہے بلکہ انسان کے بارے انتہائی مایوسی کا تصور بھی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جن ممالک میں بھی اشتراکیت کا طوفان اُٹھا ان میں سب سے پہلے انسان اور اس کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کی ایک عام فضا قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور انسانوں کو باور کرایا گیا کہ اُن کے اردگرد پھیلی ہوئی بُرائیاں صرف اشتراکیت کے ذریعے ہی دُور کی جاسکتی ہیں اور اصلاح کا کوئی دوسرا پروگرام کسی طرح مؤثر ثابت نہیں ہوسکتا۔ اگر سرمایہ دار ممالک اشتراکیت کے مادّی فلسفے کو ماننے کے باوجود اُس کے اس فیصلے سے اختلاف رکھتے ہیں اور اپنے معاشی ڈھانچوں میں بعض تبدیلیاں کر کے خاطر خواہ نتائج حاصل کر چکے ہیں تو مایوسی کے اس نظریہ کو وہ قوم کس طرح اپنا سکتی ہے جو مایوسی کو کفر سمجھتی ہے اور انسان کو اس کائنات میں خدا کا نائب خیال کرتی ہے۔

مسلمانوں کے اندر جو لوگ اشتراکیت کے علمبردار بن کر اٹھے ہیں، وہ معاشرے میں یاس و قنوطیت پھیلانے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ انسان اپنے ماضی، اپنی اقدارِ حیات اور اپنے رہنماؤں سے مایوس ہو کر اشتراکیت کا قلادہ گلے میں پہننے پر آمادہ ہوسکتا ہے مگر انہیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کیا وہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں مایوسی کے ان خیالات کو اچھی طرح جاگزیں کر سکتے ہیں اس معاملے میں انہیں دو باتوں کے بارے میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔

(۱) مادّیت لازمی طور پر انسان کے اندر یاس و قنوطیت کے جذبات پیدا کرتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مایوسی الحاد اور مادّیت کا خاصہ ہے۔ قوموں کی زندگی پر یہ نظام وہی اثرات مترتب کرتا ہے، جو شراب کسی انسان کے مزاج اور اعصاب پر مترتب کرتی ہے۔ جو قومیں

(باقی ص ۲۴ پر)

تفہیم القرآن

البلد

نام | پہلی ہی آیت لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ کے لفظ البلد کو اِس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اس کا مضمون اور اندازِ بیان مکّۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی سُورتوں کا سا ہے مگر ایک اشارہ اس میں ایسا موجود ہے جو پتہ دیتا ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ وہ تھا جب کفارِ مکّہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دشمنی پر تُل گئے تھے اور آپ کے خلاف ہر ظلم و زیادتی کو انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیا تھا۔

موضوع اور مضمون | اس سُورے میں ایک بہت بڑے مضمون کو چند جُملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے اور یہ قرآن کا کمالِ ایجاز ہے کہ ایک پُورا نظریۂ حیات، جسے مشکل سے ایک ضخیم کتاب میں بیان کیا جا سکتا تھا، اِس چھوٹی سی سُورۃ کے چھوٹے چھوٹے فقروں میں نہایت مُؤثر طریقہ سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اِس کا موضوع دنیا میں انسان کی، اور انسان کے لیے دنیا کی صحیح حیثیت سمجھانا اور یہ بتانا ہے کہ خدا نے انسان کے لیے سعادت اور شقاوت کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیئے ہیں، اُن کو دیکھنے اور اُن پر چلنے کے وسائل بھی اُسے فراہم کر دیئے ہیں، اور اب یہ انسان کی اپنی کوشش اور محنت پر موقوف ہے کہ وہ سعادت کی راہ چل کر اچھے انجام کو پہنچتا ہے یا شقاوت کی راہ اختیار کر کے بُرے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔

سب سے پہلے شہرِ مکّہ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر گزرنے والے مصائب اور پُوری اولادِ آدم کی حالت کو اِس حقیقت پر گواہ کی حیثیت سے پیش

کیا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے آرام گاہ نہیں ہے جس میں وہ مزے اڑانے کے لیے پیدا کیا گیا ہو، بلکہ یہاں اس کی پیدائش ہی مشقت کی حالت میں ہوئی ہے۔ اِس مضمون کو اگر سُورۂ نجم کی آیت ۳۹ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اِس کارگاہِ دنیا میں انسان کے مستقبل کا انحصار اس کی سعی و کوشش اور محنت و مشقت پر ہے۔

اِس کے بعد انسان کی یہ غلط فہمی دُور کی گئی ہے کہ یہاں بس وہی وہ ہے اور اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جو اُس کے کام کی نگرانی کرنے والی اور اُس پر مواخذہ کرنے والی ہو۔

پھر انسان کے بہت سے جاہلانہ اخلاقی تصوّرات میں سے ایک چیز کو بطورِ مثال لے کر بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اُس نے بڑائی اور فضیلت کے کیسے غلط معیار تجویز کر رکھے ہیں۔ جو شخص اپنی کبریائی کی نمائش کے لیے ڈھیروں مال لٹاتا ہے وہ خود بھی اپنی اِن شاہ خرچیوں پر فخر کرتا ہے اور لوگ بھی اسے خوب داد دیتے ہیں، حالانکہ جو ہستی اُس کے کام کی نگرانی کر رہی ہے وہ یہ دیکھتی ہے کہ اُس نے یہ مال کن طریقوں سے حاصل کیا اور کِن راستوں میں کس نیت اور کن اغراض کے لیے خرچ کیا۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو علم کے ذرائع اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دے کر اُس کے سامنے بھلائی اور بُرائی کے دونوں راستے کھول کر رکھ دیے ہیں۔ ایک راستہ وہ ہے جو اخلاق کی پستیوں کی طرف جاتا ہے اور اس پر جانے کے لیے کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی بلکہ نفس کو خوب لذّت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا راستہ اخلاق کی بلندیوں کی طرف جاتا ہے جو ایک دُشوار گزار گھاٹی کی طرح ہے کہ اُس پر چلنے کے لیے آدمی کو اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ اس گھاٹی پر چڑھنے کی بہ نسبت کھڈ میں لڑھکنے کو ترجیح دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ گھاٹی کیا ہے جس سے گزر کر آدمی بلندیوں کی طرف جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ریا اور فخر اور نمائش کے خرچ چھوڑ کر آدمی اپنا مال یتیموں اور

مسکینوں کی مدد پر خرچ کرے، اللہ اور اس کے دین پر ایمان لائے، اور ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو کر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں حصہ لے جو صبر کے ساتھ حق پرستی کے تقاضوں کو پورا کرنے والا اور خلق خدا پر رحم کھانے والا ہو۔ اس راستے پر چلنے والوں کا انجام یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رحمتوں کا مستحق ہو، اور اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کا انجام دوزخ کی آگ ہے جس سے نکلنے کے سارے دروازے بند ہیں۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

نہیں[1]، میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی[2] اور حال یہ ہے کہ (اے نبی) اس شہر میں تم کو حلال کر لیا گیا ہے[3]، اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی۔ درحقیقت ہم نے

---

[1] اس سے پہلے ہم سورۂ قیامہ حاشیہ نمبر ۱ میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ کلام کا آغاز "نہیں" سے کرنا اور پھر قسم کھا کر آگے کی بات شروع کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ لوگ کوئی غلط بات کہہ رہے تھے جس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ نہیں، بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھے بیٹھے ہو، بلکہ میں فلاں فلاں چیزوں کی قسم کھاتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ بات کیا تھی جس کی تردید میں یہ کلام نازل ہوا، تو اس پر بعد کا مضمون خود دلالت کر رہا ہے۔ کفار مکہ یہ کہتے تھے کہ ہم جس طرز زندگی پر چل رہے ہیں اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، دنیا کی زندگی بس یہی کچھ ہے کہ کھاؤ پیو، مزے اڑاؤ، اور جب وقت آئے تو مر جاؤ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خواہ مخواہ ہمارے اس طرز زندگی کو غلط ٹھیرا رہے ہیں اور ہمیں ڈرا رہے ہیں کہ اس پر کبھی ہم سے باز پرس ہو گی اور ہمیں جزا و سزا سے سابقہ پیش آئے گا۔

[2] یعنی شہر مکہ کی۔ اس مقام پر یہ بات کھولنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس شہر کی قسم کیوں کھائی جا رہی ہے۔ اہل مکہ اپنے شہر کا پس منظر خود جانتے تھے کہ کس طرح ایک بے آب و گیاہ وادی میں سنسان پہاڑوں کے درمیان حضرت ابراہیم نے اپنی ایک بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو یہاں لا کر بے سہارا چھوڑا، کس طرح یہاں ایک گھر بنا کر ایسی حالت میں حج کی منادی کی جبکہ دور دور تک کوئی اس منادی کا سننے والا نہ تھا، اور پھر کس طرح یہ شہر آخر کار تمام عرب کا مرکز بنا اور ایسا حرم قرار پایا کہ صدہا برس تک عرب کی سرزمین بے آئین میں اس کے سوا امن کا کوئی مقام نہ تھا۔

انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے[۵]۔ کیا اُس نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُس پر کوئی قابو نہ پاسکے گا؟[۶]

[۳] اصل الفاظ ہیں اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ اس کے تین معنی مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اِس شہر میں مقیم ہیں اور آپ کے مقیم ہونے سے اِس کی عظمت میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ یہ شہر حرم ہے مگر ایک وقت آئے گا جب کچھ دیر کے لیے یہاں جنگ کرنا اور دشمنانِ دین کو قتل کرنا آپ کے لیے حلال ہوجائے گا۔ تیسرے یہ کہ اِس شہر میں جنگل کے جانوروں تک کو مارنا اور درختوں تک کو کاٹنا اہلِ عرب کے نزدیک حرام ہے اور ہر ایک کو یہاں امن میسر ہے، لیکن حال یہ ہوگیا ہے کہ اے نبی، تمہیں یہاں کوئی امن نصیب نہیں، تمہیں ستانا اور تمہارے قتل کی تدبیریں کرنا حلال کرلیا گیا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں تینوں معنوں کی گنجائش ہے، لیکن جب ہم آگے کے مضمون پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ پہلے دو معنی اُس سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور تیسرا مفہوم ہی اس سے میل کھاتا ہے۔

[۴] چونکہ مطلقاً باپ اور اُس سے پیدا ہونے والی اولاد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور آگے انسان کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے باپ سے مراد آدم علیہ السلام ہی ہوسکتے ہیں، اور اِن سے پیدا ہونے والی اولاد سے مراد وہ تمام انسان ہیں جو دنیا میں پائے گئے ہیں، اب پائے جاتے ہیں اور آئندہ پائے جائیں گے۔

[۵] یہ ہے وہ بات جس پر وہ قسمیں کھائی گئی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔ انسان کے مشقت میں پیدا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اِس دنیا میں مزے کرنے اور چین کی بنسری بجانے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے لیے یہ دنیا محنت اور مشقت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اِس حالت سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شہر مکہ گواہ ہے کہ کسی اللہ کے بندے نے اپنی جان کھپائی تھی تب یہ بسا اور عرب کا مرکز بنا۔ اِس شہر مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت گواہ ہے کہ وہ ایک مقصد کے لیے طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں، حتیٰ کہ یہاں جنگل کے جانوروں کے لیے امان ہے مگر اُن کے لیے نہیں ہے۔ اور ہر انسان کی زندگی ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر موت کے آخری سانس تک اس بات پر گواہ ہے کہ اُس کو قدم قدم پر تکلیف، مشقت، محنت، خطرات اور شدائد کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کو تم بڑی سے بڑی قابلِ رشک حالت میں دیکھتے

کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا؟ کیا ہم نے

ہو وہ بھی جب ماں کے پیٹ میں تھا تو ہر وقت اِس خطرے میں مبتلا تھا کہ اندر ہی مر جاتے یا اس کا اسقاط ہو جائے۔ زچگی کے وقت اُس کی موت اور زندگی کے درمیان بال بھر سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ پیدا ہوا تو اتنا بے بس تھا کہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہ ہوتا تو پڑے پڑے ہی سسک سسک کر مر جاتا۔ چلنے کے قابل ہوا تو قدم قدم پر گرا پڑتا تھا۔ بچپن سے جوانی اور بڑھاپے تک ایسے ایسے جسمانی تغیرات سے اس کو گزرنا پڑا کہ کوئی تغیر بھی اگر غلط سمت میں ہو جاتا تو اس کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ وہ اگر بادشاہ یا ڈکٹیٹر بھی ہے تو کسی وقت اِس اندیشے سے اُس کو چین نصیب نہیں ہے کہ کہیں اُس کے خلاف کوئی سازش نہ ہو جائے۔ وہ اگر فاتحِ عالم بھی ہے تو کسی وقت اِس خطرے سے امن میں نہیں ہے کہ اُس کے اپنے سپہ سالاروں میں سے کوئی بغاوت نہ کر بیٹھے۔ وہ اگر اپنے وقت کا قارون بھی ہے تو اس فکر میں ہر وقت غلطاں و پیچاں ہے کہ اپنی دولت کیسے بڑھائے اور کس طرح اس کی حفاظت کرے۔ غرض کوئی شخص بھی بے غل و غش چین کی نعمت سے بہرہ مند نہیں ہے، کیونکہ انسان پیدا ہی مشقت میں کیا گیا ہے۔

۵ یعنی کیا یہ انسان جو اِن حالات میں گھرا ہوا ہے، اِس غرّے میں مبتلا ہے کہ وہ دنیا میں جو کچھ چاہے کرے، کوئی بالاتر اقتدار اُس کو پکڑنے اور اس کا سر نیچا کر دینے والا نہیں ہے؟ حالانکہ آخرت سے پہلے خود اِس دنیا میں بھی ہر آن وہ دیکھ رہا ہے کہ اُس کی تقدیر پر کسی اور کی فرمانروائی قائم ہے جس کے فیصلوں کے آگے اس کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ زلزلے کا ایک جھٹکا، ہوا کا ایک طوفان، دریاؤں اور سمندروں کی ایک طغیانی اُسے یہ بتا دینے کے لیے کافی ہے کہ خدائی طاقتوں کے مقابلے میں وہ کتنا بل بوتا رکھتا ہے۔ ایک اچانک حادثہ اچھے خاصے بھلے چنگے انسان کو اپاہج بنا کر رکھ دیتا ہے۔ تقدیر کا ایک پلٹا بڑے سے بڑے با اقتدار آدمی کو عرش سے فرش پر لا گراتا ہے۔ عروج کے آسمان پر پہنچی ہوئی قوموں کی قسمتیں جب بدلتی ہیں تو وہ اُسی دنیا میں ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتی ہیں جہاں کوئی اُن سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ اِس انسان کے دماغ میں آخر کہاں سے یہ ہوا بھر گئی کہ کسی پر اس کا بس نہیں چل سکتا؟

۶ اَنْفَقْتُ مَالًا لُّبَدًا "میں نے ڈھیر سا مال خرچ کر دیا" نہیں کہا بلکہ اَھْلَکْتُ مَالًا لُّبَدًا کہا جس کے لفظی معنی ہیں "میں نے ڈھیر سا مال ہلاک کر دیا"، یعنی لٹا دیا، یا اڑا دیا۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے

اسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے؟ اور دونوں نمایاں راستے اُسے نہیں (دکھا دیئے؟)

ہیں کہ کہنے والے کو اپنی مال داری پر کتنا فخر تھا کہ جو ڈھیر سا مال اُس نے خرچ کیا وہ اُس کی مجموعی دولت کے مقابلے میں اتنا ہیچ تھا کہ اُس کے لٹا دینے یا اُڑا دینے کی اُسے کوئی پروا نہ تھی۔ اور یہ مال اُٹھا دیتا تھا کس مد میں؟ کسی حقیقی نیکی کے کام میں نہیں، جیسا کہ آگے کی آیات سے خود بخود مترشح ہوتا ہے، بلکہ اپنی دولتمندی کی نمائش اور اپنے فخر اور اپنی بڑائی کے اظہار میں۔ قصیدہ گو شاعروں کو بھاری انعامات دینا۔ شادی اور غمی کی رسموں میں سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی دعوت کر ڈالنا۔ جوئے میں ڈھیروں دولت ہار دینا۔ جوا جیت جانے پر اُونٹ پر اُونٹ کاٹنا اور خوب یار دوستوں کو کھلانا۔ میلوں میں بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ جانا اور دوسرے سرداروں سے بڑھ کر شان و شوکت کا مظاہرہ کرنا۔ تقریبات میں بے تحاشا کھانے پکوانا اور اذنِ عام دے دینا کہ جس کا جی چاہے آئے اور کھائے، یا اپنے ڈیرے پر کھُلا لنگر جاری رکھنا کہ دُور دُور تک یہ شہرت ہو جائے کہ فلاں رئیس کا دسترخوان بڑا وسیع ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے نمائشی اخراجات تھے جنہیں جاہلیت میں آدمی کی فیاضی اور فراخ دلی کی علامت اور اُس کی بڑائی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ اِنہی پر ان کی تعریفوں کے ڈنکے بجتے تھے۔ انہی پر ان کی مدح کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ اور وہ خود بھی اِن پر دوسروں کے مقابلے میں اپنا فخر جتاتے تھے۔

۸ یعنی کیا یہ فخر جتانے والا یہ نہیں سمجھتا کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے جو دیکھ رہا ہے کہ کن ذرائع سے اس نے یہ دولت حاصل کی، کن کاموں میں اسے کھپایا، اور کس نیت، کن اغراض اور کن مقاصد کے لیے اس نے یہ سارے کام کیے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ خدا کے ہاں اِس فضول خرچی، اس شہرت طلبی اور اس تفاخر کی کوئی قدر ہوگی؟ کیا اس کا خیال ہے کہ دنیا کی طرح خدا بھی اِس سے دھوکا کھا جائے گا؟

۹ مطلب یہ ہے کہ کیا ہم نے اُسے علم اور عقل کے ذرائع نہیں دیئے؟ دو آنکھوں سے مراد گائے بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اُسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو حقیقت کا پتہ دیتے ہیں اور صحیح و غلط کا فرق سُجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد محض بولنے کے آلات نہیں ہیں بلکہ نفسِ ناطقہ ہے جو ان آلات کی پُشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا ہے اور پھر ان سے اظہار ما فی الضمیر کا کام لیتا ہے۔

۱۰ یعنی ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے اُسے چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے۔

دکھا دیئے؟ مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی۔[11] اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا، یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔[12] پھر (اس کے ساتھ یہ کہ) آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے[13] اور جنہوں

بلکہ اس کی رہنمائی بھی کی اور اس کے سامنے بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی کے دونوں راستے نمایاں کرکے رکھ دیئے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمہ داری پر اختیار کرلے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ دہر میں فرمائی گئی ہے کہ "ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سُننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا" (آیات ۲-۳)۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، الدہر، حواشی ۳ تا ۵۔

۱۱؎ اصل الفاظ ہیں فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ۔ اِقتحام کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی سخت اور مشقت طلب کام میں ڈالنا۔ اور عَقَبَہ اُس دشوار گزار راستے کو کہتے ہیں جو بلندی پر جانے کے لیے پہاڑوں میں سے گزرتا ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دو راستے جو ہم نے اُسے دکھائے ان میں سے ایک بلندی کی طرف جاتا ہے مگر مشقت طلب اور دشوار گزار ہے۔ اُس میں آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشوں سے اور شیطان کی ترغیبات سے لڑ کر چلنا پڑتا ہے۔ اور دوسرا آسان راستہ ہے جو کھڈوں میں اُترتا ہے، مگر اُس سے پستی کی طرف جانے کے لیے کسی محنت کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ بس اپنے نفس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دینا کافی ہے، پھر آدمی خود نشیب کی طرف لُڑھکتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ آدمی جس کو ہم نے دونوں راستے دکھا دیئے تھے، اِس نے اُن میں سے پستی کی جانب جانے والے راستے کو اختیار کرلیا اور اُس مشقت طلب راستے کو چھوڑ دیا جو بلندی کی طرف جانے والا ہے۔

۱۲؎ اُوپر چونکہ اُس کی فضول خرچیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی بڑائی کی نمائش اور لوگوں پر اپنا فخر جتانے کے لیے کرتا ہے، اس لیے اب اس کے مقابلے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کونسا خرچ اور مال کا کونسا مصرف ہے جو اخلاق کی پستیوں میں گرانے کے بجائے آدمی کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے، مگر اُس میں نفس کی کوئی لذت نہیں بلکہ آدمی کو اس کے لیے اپنے نفس پر جبر کرکے ایثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی کسی غلام کو خود آزاد کرے، یا اس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا فدیہ ادا کرکے رہائی حاصل کرلے، یا کسی غریب کی گردن قرض کے جال سے نکالے، یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی تاوان

کے بوجھ سے لدگیا ہو تو اس کی جان اُس سے چھڑائے۔ اسی طرح وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم (یعنی رشتہ دار یا پڑوسی یتیم) اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی مدد سے آدمی کی شہرت کے ڈنکے تو نہیں بجتے اور نہ اُن کو کھلا کر آدمی کی دولت مندی اور دریا دلی کے وہ چرچے ہوتے ہیں جو ہزاروں کھاتے پیتے لوگوں کی شاندار دعوتیں کرنے سے ہوا کرتے ہیں، مگر اخلاق کی بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ اسی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔

اِن آیات میں نیکی کے جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے، اُن کے بڑے فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً فَکُّ رَقَبَۃٍ (گردن چھڑانے) کے بارے میں حضورؐ کی بکثرت احادیث روایات میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے ایک حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اُس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچالے گا، ہاتھ کے بدلے میں ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں شرمگاہ کے بدلے میں شرمگاہ (مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)۔ حضرت علی بن حسینؓ (امام زین العابدین) نے اس حدیث کے راوی سعید بن مرجانہ سے پوچھا کیا تم نے ابوہریرہؓ سے یہ حدیث خود سُنی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ اس پر امام زین العابدین نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بُلوایا اور اُسی وقت اُسے آزاد کر دیا۔ مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس غلام کے لیے اُن کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔ امام ابوحنیفہ اور امام شعبی نے اسی آیت کی بنا پر کہا ہے کہ غلام آزاد کرنا صدقے سے افضل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صدقے پر مقدم رکھا ہے۔

مساکین کی مدد کے فضائل بھی حضورؐ نے بکثرت احادیث میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا الساعی علی الارملۃ والمسکین کالساعی فی سبیل اللہ واحسبہ قال کالقائم لایفتر وکالصائم لایفطر "بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا۔" اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ، مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو نماز میں کھڑا رہے اور آرام نہ لے اور وہ جو پے در پے روزے رکھے اور کبھی روزہ نہ چھوڑے" (بخاری و مسلم)۔

یتامیٰ کے بارے میں تو حضورؐ کے بے شمار ارشادات ہیں۔ حضرت سہلؓ بن سعد کی روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا میں اور وہ شخص جو کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے، جنت میں اِس طرح ہوں گے۔ یہ فرما کر آپ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو اٹھا کر دکھایا اور دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا" (بخاری)۔ حضرت ابوہریرۃؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے نیک سلوک ہو رہا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے بُرا سلوک ہو رہا ہو" (ابن ماجہ۔ بخاری فی الادب المفرد)۔ حضرت ابو اُمامہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محض اللہ کی خاطر پھیرا اُس بچے کے ہر بال کے بدلے جس پر اُس شخص کا ہاتھ گزرا اُس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی، اور جس نے کسی یتیم لڑکے یا لڑکی کے ساتھ نیک برتاؤ کیا وہ اور میں جنت میں اس طرح ہونگے۔ اور یہ فرما کر حضورؐ نے اپنی دو انگلیاں ملا کر بتائیں" (مسند احمد۔ ترمذی)۔ ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ سرکارِ رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا "جس نے کسی یتیم کو اپنے کھانے اور پینے میں شامل کیا اللہ نے اس کے لیے جنت واجب کر دی اِلّا یہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ کر بیٹھا ہو جو معاف نہیں کیا جا سکتا" (شرح السنّہ)۔ حضرت ابوہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے شکایت کی کہ میرا دل سخت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور مسکین کو کھانا کھلا" (مُسند احمد)۔

۱۲؎ یعنی اِن اوصاف کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آدمی مومن ہو، کیونکہ ایمان کے بغیر نہ کوئی عمل عملِ صالح ہے اور نہ اللہ کے ہاں وہ مقبول ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اِس کی تصریح کی گئی ہے کہ نیکی وہی قابلِ قدر اور ذریعۂ نجات ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔ مثلاً سورۂ نساء میں فرمایا "جو نیک اعمال کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہونگے" (آیت ۱۲۴)۔ سورۂ نحل میں فرمایا "جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، تو ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور ایسے لوگوں کو اُن کا اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق عطا کریں گے" (آیت ۹۷)۔ سورۂ مومن میں فرمایا "اور جو نیک عمل کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور ہو وہ مومن، ایسے لوگ جنت میں داخل ہونگے، وہاں اُن کو بے حساب رزق دیا جائے گا" (آیت ۴۰)۔ قرآنِ پاک کا جو شخص بھی مطالعہ کرے گا وہ یہ دیکھے گا کہ اس کتاب میں جہاں بھی عملِ صالح کے

نے ایک دوسرے کو صبر اور (خلقِ خدا پر) رحم کی تلقین کی۔[14] یہ لوگ ہیں دائیں بازو والے۔ اور جنہوں
ع نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کیا وہ بائیں بازو والے ہیں[15]، اُن پر آگ چھائی ہوئی ہوگی[16]۔ ع

اجر اور اس کی جزائے خیر کا ذکر کیا گیا ہے وہاں لازماً اُس کے ساتھ ایمان کی شرط لگی ہوئی ہے۔ عمل بلا ایمان کو کہیں بھی خدا کے ہاں مقبول نہیں قرار دیا گیا ہے اور نہ اس کے کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔

اس مقام پر یہ اہم نکتہ بھی نگاہ سے مخفی نہ رہنا چاہیے کہ آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ "پھر وہ ایمان لایا" بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ "پھر وہ اُن لوگوں میں شامل ہوا جو ایمان لائے"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ محض ایک فرد کی حیثیت سے اپنی جگہ ایمان لا کر رہ جانا مطلوب نہیں ہے، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہر ایمان لانے والا اُن دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جائے جو ایمان لائے ہیں تاکہ اس سے اہلِ ایمان کی ایک جماعت بنے، ایک مومن معاشرہ وجود میں آئے، اور اجتماعی طور پر اُن بھلائیوں کو قائم کیا جائے جن کا قائم کرنا، اور اُن برائیوں کو مٹایا جائے جن کا مٹانا ایمان کا تقاضا ہے۔

[14] یہ مومن معاشرے کی دو اہم خصوصیات ہیں جن کو دو مختصر فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں۔ اور دوسری یہ کہ وہ ایک دوسرے کو رحم کی تلقین کریں۔

جہاں تک صبر کا تعلق ہے، ہم اس سے پہلے بارہا اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ قرآن مجید جس وسیع مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے اُس کے لحاظ سے مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے۔ خدا کے احکام کی اطاعت و پیروی میں صبر کی ضرورت ہے۔ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اخلاق کی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔ قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہو سکتا ہے۔ بے شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات، تکالیف، مصائب، اور محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مومن بخیریت نہیں گزر سکتا۔ پھر ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل و عیال، اپنے خاندان، اپنے معاشرے، اپنے ملک و قوم اور دنیا بھر کے شیاطینِ جن و انس کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ راہِ خدا میں

ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہوگا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا۔ بخلاف اس کے اگر ایک مومن معاشرہ ایسا موجود ہو جس کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے سارے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اس ہمہ گیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانیاں اس معاشرے کے قدم چومیں گی۔ بدی کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائیگی۔ انسانی معاشرے کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائیگا۔ رہا رحم تو اہل ایمان کے معاشرے کی امتیازی شان یہی ہے کہ وہ ایک سنگدل بے رحم اور ظالم معاشرہ نہیں ہوتا بلکہ انسانیت کے لیے رحیم و شفیق اور آپس میں ایک دوسرے کا ہمدرد و غمخوار معاشرہ ہوتا ہے۔ فرد کی حیثیت سے بھی ایک مومن اللہ کی شانِ رحیمی کا مظہر ہے، اور جماعت کی حیثیت سے بھی مومنوں کا گروہ خدا کے اُس رسول کا نمائندہ ہے جس کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء۔۱۰۷)۔ آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سب سے بڑھ کر جس بلند اخلاقی صفت کو اپنی اُمّت میں فروغ دینے کی کوشش فرمائی ہے وہ یہی رحم کی صفت ہے۔ مثال کے طور پر آپ کے حسبِ ذیل ارشادات ملاحظہ ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں اِس کی کیا اہمیت تھی۔ حضرت جریر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ (بخاری، مُسلم)
اللہ اُس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

الراحمون یرحمہم الرحمٰن۔ ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء۔ (ابوداؤد، ترمذی)
رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرتا ہے۔ زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

حضرت ابوسعید خدری حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

من لا یَرحم لا یُرحم (بخاری فی الادب المفرد)
جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

لیس منّا من لم یرحم صغیرنا ولم یُوقّر کبیرنا (ترمذی)
وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھائے اور بڑے کی توقیر نہ کرے۔

ابوداؤد نے حضورؐ کے اِس ارشاد کو حضرت عبداللہ بن عمرؓو کے حوالہ سے یوں نقل کیا ہے:

من لم یرحم صغیرنا ولیعرف حق کبیرنا فلیس منّا۔

جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کھایا اور ہمارے بڑے کا حق نہ پہچانا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ مَیں نے ابوالقاسم صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

لاتُنزَع الرحمة الّا من شقیٍ (مُسند احمد۔ ترمذی)

بدبخت آدمی کے دل ہی سے رحم سلب کرلیا جاتا ہے۔

حضرت عیاض بن حِمار کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تین قسم کے آدمی جنّتی ہیں۔ ان میں سے ایک:

رجل رحیم رقیق القلب لکل ذی قربی ومسلم (مسلم)

وہ شخص ہے جو ہر رشتہ دار اور ہر مسلمان کے لیے رحیم اور رقیق القلب ہو۔

حضرت نعمانؓ بن بشیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تریٰ المومنین وتراحمہم وتوادھم و تعاطفہم کمثل الجسد اذا اشتکیٰ عضواً تداعیٰ له سائر الجسد بالسّہر والحمّٰی (بخاری ومسلم)

تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبّت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ اگر ایک عضو میں کوئی تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

المومن للمؤمن کالبنیان یشدّ بعضه بعضاً (بخاری ومسلم)

مومن دوسرے مومن کے لیے اُس دیوار کی طرح ہے جس کا ہر حصّہ دوسرے حصّے کو مضبوط کرتا ہے

حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

المسلم اخو المسلم لایظلمه ولایُسلمه ومن کان فی حاجة اخیه کان اللہ فی حاجته ومن فرّج عن مسلم کُربةً فرّج اللہ عنه کربةً من کُربات یوم القیامة ومن ستر مسلماً ستره اللہ یوم القیامة۔ (بخاری ومسلم)

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کی مدد سے باز رہتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی کسی حاجت کو پُورا کرنے میں لگا ہوگا اللہ اس کی حاجت پُوری کرنے میں لگ جائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے نکالے گا اللہ تعالیٰ اُسے روزِ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت سے نکال دیگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت معلّم

(جناب نعیم صدیقی صاحب ڈائرکٹر ادارۂ مطالعہ وتحقیق)

[یہ مقالہ تنظیمِ اساتذۂ پاکستان کی تعلیمی کانفرنس منعقدہ مری (جولائی ۷۱ء) میں پیش کیا گیا تھا۔ مقالہ لکھتے ہوتے اُس مجوزہ تعلیمی انقلاب کے مسائل وضروریات میرے پیشِ نظر رہے جس کے لیے پاکستان کی ذہنی فضا میں ایک جذبۂ بے تاب نشوونما پا چکا ہے۔]

آغاز، خداوند علیم وحکیم کے نام سے جو اپنی پیدا کردہ ہر مخلوق کے لیے خلق کے ساتھ ہی ساتھ اس کی تقدیر معیّن کرتا ہے اور اس کے لیے راہِ ہدایت کی نشاندہی کرتا ہے ____ جس نے اپنے پیدا کردہ آدمؑ کو علم الاسماء کے اعزاز سے نوازا، اور جو تمام انسانوں کے لیے اوّلین معلّمِ حقیقت و ہدایت ہے صدہا سلام اُس انسانِ عظیمؐ پر، جسے خود انسانوں ہی کے اندر سے بشیر ونذیر بنا کر اٹھایا گیا، اور ساری انسانیت کے لیے معلّمِ فلاح وسعادت کے منصب پر قیامت تک کے لیے مامور کیا گیا ؎

(بقیہ تفہیم القرآن)

اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کریگا اللہ قیامت کے روز اس کی عیب پوشی کرے گا۔

اِن ارشادات سے معلوم ہوجاتا ہے کہ نیک اعمال کرنے والوں کو ایمان لانے کے بعد اہلِ ایمان کے گروہ میں شامل ہونے کی جو ہدایت قرآن مجید کی اِس آیت میں دی گئی ہے اُس سے کس قسم کا معاشرہ بنانا مقصود ہے۔

۱۵؎ دائیں بازو اور بائیں بازو کی تشریح ہم سُورۂ واقعہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد پنجم، الواقعہ، حواشی ۵-۶۔

۱۶؎ یعنی آگ اِس طرح اُن کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی کہ اُس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔

کہ جس کی تعلیم کی صداقت اور جس کے معلمانہ کردار کی اعجاز آفرینی پر تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ گواہ ہے کہ سرزمینِ حجاز کے صحرائی کلاس روم میں معلمؐ صدق وصفا سے درس لینے والی تہذیب ناآشنا قوم دیکھتے دیکھتے اقوامِ عالم کے لیے نہ صرف راستی، مساوات، عدل، اخوت، احسان اور امن کی رہنما بن گئی بلکہ اس نے تدبر و تفکر کی کنجیوں سے علوم و فنون کے بند خزانوں کے دروازے ساری نوعِ انسانی کے لیے کھول دیئے۔ حق یہ ہے کہ حضورؐ ہی کی تیار کردہ جماعت نے بین الاقوامی دورِ تہذیب کا افتتاح کیا، اور آج کے فاسد علوم اور بے توازن تحریکوں میں جہاں کہیں کسی قابلِ قدر جوہر کا کوئی ذرہ چمکتا دکھائی دیتا ہے، یہ اسی قومِ محمدؐ کے فیضان کی یادگار ہے جو دوسروں کو منزل کا سراغ بتانے کے بعد خود اپنا سُراغ گم کر بیٹھی۔

اصل بحث کا آغاز کرنے سے پہلے میں اپنے اس احساسِ ندامت کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ملتِ اسلامیہ ہونے کی حیثیت میں ہم نے نبی پاکؐ جیسے عظیم ترین معلّم ایمان وعمل کی پیروی کا حق ادا نہیں کیا ہمارا مقام یہ تھا کہ ہم حضورؐ کو اپنی تمام فکری وعملی سرگرمیوں میں سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے، اپنے کاروانِ حیات کو ہر پیچ وخمِ تاریخ سے گذارتے ہوئے حضورؐ کا دامنِ قیادت تھامتے، اور سیاست و اقتصاد اور تعلیم و دفاع اور دوسرے تمام شعبہ ہائے کار میں حضورؐ کے معلمانہ منصب سے روشنی حاصل کرتے۔ مگر ہماری افسوسناک حرکت یہ ہے کہ ہم اُس ہستی کو جو قائدِ تہذیبِ انسانی تھی، ایک آراستہ و پیراستہ عجائب خانۂ عقیدت میں مسند آرا کر کے اپنے قافلہ ہائے فکر وعمل کو وادی وادی میں گھماتے پھرتے ہیں۔ موجودہ بحران زدہ تہذیب کے بدراہ اور پراگندہ فکر اکابر کے دروازوں پر ہدایت کی بھیک مانگنے کے لیے مرعوبیت کا کشکول اٹھائے صدا لگاتے ہیں۔

تاریخ اور علم کے اُفق پر اُبھرنے والے نت نئے "آفلین" کی عارضی درخشانی کو دیکھ کر جھومتے ہوئے پکار اُٹھتے ہیں کہ یہ رہا ہمارا مقصودِ نظر۔ پھر جب جگنو کی سی چمک دکھا کر آنکھوں کا ایک تارا ڈوب جاتا ہے تو پھر کسی اور کو تلاش کر کے اُس پر مرمٹتے ہیں۔ ہمیں کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ حضورؐ کے ہوتے ہوئے ہم کیسی کیسی ٹھنگنی اور بھینگی شخصیتوں کی تقلید میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔

دوسری تمہیدی بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ دنیا میں، اور دنیا کے کسی بھی معاشرے میں بڑے بڑے بحران اس وقت آتے ہیں جب خود علم تاریکیوں میں گھر جاتا ہے، جب تعلیم بھٹک جاتی ہے جب

مکتب اپنے مقصود کو گم کر دیتا ہے، اور جب معلم اپنا فریضہ اور پارٹ صحیح طور سے ادا نہیں کرتا علم اور تعلیم کے بھٹکے ہوئے خورشید و مہ کے پرتو میں نہ سیاست صحت مند رہ سکتی ہے، نہ جمہوریت نشوونما پاتی ہے، نہ اقتصادی عدل قائم ہو سکتا ہے، نہ اخلاقی شعور اتنا زوردار ہوتا ہے کہ جرائم کا راستہ روک سکے، نہ قومی خودی اس حد تک توانا ہو سکتی ہے کہ بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے لیے دفاعی، سفارتی اور نشری قوتوں کو صحیح طور سے بروئے عمل لا سکے۔

دورِ غلامی تو الگ رہا، آزادی پانے کے بعد بھی ہم لوگ تعلیم کے بھٹکے ہوئے خورشید کے پرتو میں ۴۲ سال سے جادہ پیمائی کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ وہ بحران ہے جو بالکل ابتدا سے آہستہ آہستہ پرورش پا کر اب پوری طرح جوان ہو گیا ہے۔

اور اگر ہم نگاہ کو ذرا سا وسیع کر کے پورے عالمی احوال کو دیکھیں تو اس حقیقت سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ علوم و فنون، تنظیمات و ادارات، ذرائع و وسائل اور تفریحات و تعیشات کی تیز رفتار افزائش کے باوجود انسان تہذیبی بحران سے دوچار ہے۔ جنگوں، انقلابات، قومی و طبقاتی تعصبات، طرح طرح کے منافرت انگیز متصادم نظریات اور منحوس قسم کے خونخوارانہ جرائم کے ہجوم میں کھڑا ہوا بے بس انسان دل و دماغ کا سارا سکون گنوا کر ہمدردی کے ایک مخلصانہ بول کے لیے ترس رہا ہے۔

پس آج ملکی اور قومی لحاظ سے بھی، اور عالمی لحاظ سے بھی زندگی کو سنوارنے کے لیے سب سے زیادہ توجہ طلب شعبہ، تعلیم کا شعبہ ہے۔ اسی کی درستی پر ہماری اپنی سلامتی کا بھی انحصار ہے، اور اسی کو صحیح اصول و مقاصد کے سانچے میں ڈھال کر ہم نئی نسلوں کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ فسادِ بحر و بر میں مبتلا دنیا کو امن و انصاف کا راستہ دکھا سکیں۔

میرے مقالے کا مقصد یہی ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کی درستی کے لیے حضورؐ خاتم النبیین کی معلمانہ حیثیت کو سامنے رکھ کر کچھ مفید اشارات و نکات اخذ کر سکیں۔

حضورؐ کے معلمانہ کارنامے پر کوئی گفتگو اس وقت تک بے معنی ہو گی جب تک ہم اس حکمتِ علم اور حکمتِ تعلیم پر نظر نہ ڈال لیں جس کے مطابق حضورؐ نے سارا معلمانہ کام کیا۔

ہماری حکمتِ علم

علم کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کے ذرائع حصول کیا ہیں؟

اِن سوالوں کو چھیڑتے ہوئے جب ہم مغرب کے نظریۂ علم (THEORY OF KNOWLEDGE) کو دیکھتے ہیں تو پھر ہم پیروانِ محمدؐ اور حاملینِ قرآن کی حیثیت سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس رائج شدہ باطل نظریۂ علم کی وجہ سے تمام علوم بگڑ کر رہ گئے ہیں۔ ان میں جو تھوڑے بہت سچائی کے اجزاء ہیں وہ غلط افکار و تصوّرات کے ساتھ اس بُری طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان کے ذریعے زندگی کو پوری طرح خیر و خوبی سے آراستہ کرنا ناممکن ہے، اور جو نظامِ تعلیم محض ان علوم و افکار کو منتقل کرنے کا وسیلہ بن کے رہ گیا ہو، وہ نہ ہمیں مسلمان کے سے ایمان و کردار سے آراستہ کر سکتا ہے، اور نہ انسانیت کو موجودہ بحرانی دَور سے نجات دلا سکتا ہے۔

مغربی نظریۂ علم کے رُو سے حقیقت صرف وہ ہے جسے ہم حواس اور قیاس کے ذریعے پا سکتے ہیں ہمارے حواس اور قیاس کے دائرے سے باہر خواہ کتنے ہی بڑے سے بڑے حقائق موجود ہوں، ہمارے لیے کالعدم ہیں۔ ہم ایک خاص مرحلے میں جو کچھ اور جتنا کچھ جس شکل میں سمجھتے یا جان لیتے ہیں، اس مرحلے میں وہی کچھ حقیقت ہے، بعد میں اگر نئی معلومات پچھلے مسلّمات کو بدل دیتی ہیں تو حقیقت نئی صورت اختیار کر کے سابق صورتوں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اس نظریۂ علم کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہمارا سارا سرمایۂ علم، کسی بھی مرحلے میں، ایسے یقینیات سے خالی رہے جن پر ہم انفرادی اخلاق اور اجتماعی تہذیب کی تاسیس کر کے مطمئن ہو سکیں کہ فی الجملہ ہم نے صحیح عمارت اٹھائی ہے، اور اب مزید معلومات و تجربات کی مدد سے اسے بنانے سنوارنے کا کام جاری رکھنا ہے۔ آج کے علمی ظنّیات ایسی ٹھوس بنیادی حقیقتیں فراہم کرنے سے قاصر ہیں جن کو ہم تعمیرِ حیات کے عمل میں قابلِ اعتماد اساسیات قرار دے سکیں۔ آج کے نظریے، آج کی تحریکیں، آج کے سماجی نظام، آج کے معاشرے اُس طرح کے ریت کے گھروندے ہیں جنہیں بچے ساحلِ سمندر کی ریت سے بناتے ہیں، پھر اپنے حاصلِ محنت کو توڑتے ہیں اور بار بار اسی کھیل کو دہراتے ہیں غضب یہ کہ وہ اس کھیل کھیل میں اپنے اپنے گھروندوں کو صحیح اور بہتر اور دوسروں کے ریت کے قلعوں کو غلط اور گھٹیا قرار دے کر آپس میں لڑتے بھی ہیں۔

اس تنقیدی گفتگو کو طول دینے کے بجائے میں اُس حکمتِ علم پر چند گذارشات پیش کرتا ہوں جسے حضورؐ نے دنیا کے سامنے رکھا۔

واضح رہے کہ یہاں علم کی وہ ٹیکنیکل اقسام زیرِ بحث نہیں ہیں، جن کا مقصد زندگی کی مختلف ضروریات

پوری کرنے اور سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اسباب و وسائل پیدا کرنا اور ان کو ترقی دینا ہے۔ یہاں مدار گفتگو علم کی وہ اقسام ہیں جن کی روشنی میں انسانی رابطوں، رویّوں اور تہذیبی اداروں کی غایات طے کی جاتی ہیں۔

اس سلسلے میں نبی پاکؐ نے بہ حیثیت معلّم انسانیت ہمارے سامنے اوّلین حقیقت یہ رکھی ہے کہ علمِ کامل صرف خدا کو حاصل ہے[1]۔ وہی کائنات کے اسرار و رموز کا جاننے والا ظاہر و پنہاں سے آگاہ، اور ماضی اور مستقبل کا خبیر و بصیر ہے۔

انسان کو جو کچھ علم حاصل ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب اسی کا عطیہ ہے[2]۔ انسان کو جو محدود ذرائع علم حاصل ہیں وہ اسی کے عطا کردہ ہیں۔ سماعت، بصارت اور تفکّر کی قوتیں اسی نے دی ہیں[3]۔ انسانی علم کے متعلق یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ صدیوں کی حاصل کردہ ترقیوں کے باوجود اور مستقبل کے ہونے والے انکشافات سمیت بہت ہی محدود ہے[4]۔ خدا کے علمِ کامل کو سامنے رکھتے ہوئے جب انسان کو اپنے علمِ قلیل کی محدودیّت کا اندازہ ہو جاتا ہے تو لازمی طور پر اس میں ایک تو طلبِ علم پیدا ہوگی، اور دوسرے وہ علمِ کامل کے سرچشمہ سے استفادہ کرنے کے لیے کوشاں ہوگا۔ اور اس سے استفادہ کے وسیلے کو تلاش کرے گا جو صاحبِ علمِ کامل اور اس کے زیرِ تعلیم متعلّم کے درمیان بروئے عقل موجود ہونا چاہیے۔ اپنے علم کی محدودیّت کا شعور انسان کو اِس جسارتِ بے جا سے بھی روکنے کا ذریعہ ہے کہ وہ اپنی ناقص اور مشکوک معلومات پر نت نئے نظاموں اور تمدنوں کے بے ڈھنگے اور غیر متوازن ڈھانچے کھڑے کرے، ان پر اندھا دھند انسانی قربانیوں اور محنتوں کی بھاری مقداریں صرف کرے، اور پھر وہ یکے بعد دیگرے خوفناک تباہی کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہیں۔ حضورؐ کی حکمتِ علم انسان کو یہ بتاتی ہے کہ انسانی علم کائنات میں خدائی اور کارفرمائی کا پارٹ ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس علم کی محدودیت گواہ ہے کہ انسان بندگی و نیابت کے

---

[1] ملاحظہ ہوں آیات: اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ (۶۷-۲۶، ۴۶-۲۳)۔ اِنَّ اللّٰهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳۵-۳۸)۔ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ (۶-۳) وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۴-۳۰) وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا (۶-۸۰)، يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (۲-۲۵۵)

[2] ملاحظہ ہو آیت: عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶-۵) [3] ملاحظہ ہو آیت: وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (۶۷-۲۳) [4] ملاحظہ ہو آیت: وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷-۸۵)

مقام پر رہ کر کسی بالاتر ہستی کے زیرِ ہدایت کام کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے [۵]۔

علمِ قلیل کے مقام پر ہونے کی وجہ سے انسان مجبور ہے کہ وہ نہ صرف حسّی اور قیاسی ذرائع سے کام لے کر اپنے علم میں مسلسل اضافہ کرے، بلکہ حسّی و قیاسی دائرے سے بالاتر کسی دوسرے ذریعۂ علم کا بھی سراغ لگائے جو تعمیرِ حیات کے لیے چند یقینی اساسیات مہیا کر سکے۔ پس انسان ایک لامتناہی وادیٔ علم کا مسافر ہے جس کے لیے کمر کھولنے کی منزل کہیں نہیں آتی۔ حضورؐ کے ذریعے اضافۂ علم کی دعا جذبۂ طلبِ علم کو متحرک رکھنے کے لیے سکھائی گئی ہے [۶]۔

مگر دوسرے نظریوں کے مقابلے میں اسلامی حکمتِ تعلیم یہ چاہتی ہے کہ مسافرِ علم کے سامنے کچھ نشاناتِ راہ ضرور واضح ہوں، اس کے پاس کچھ نہ کچھ زادِ راہ بھی ہو، اور وہ مشعل بھی ساتھ رکھتا ہو جو تاریکیوں میں راستہ دکھا سکے۔ نبی اکرمؐ کی عطا کردہ قرآنی حکمت کی رُو سے تین حقیقتیں ایسی ہیں جن کے صحیح شعور پر انفرادی کردار اور اجتماعی نظام کی صحت کا دار و مدار ہے۔

ان میں سے اوّلین حقیقتِ عظمیٰ (SUPREME REALITY) خدا کی ہستی ہے۔ یہاں میں خدا کی ہستی پر دلائل نہیں دوں گا۔ کہنا یہ ہے کہ اسلامی حکمتِ علم کی بنیاد تصوّرِ خدا پر ہے۔ اس کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق کا شعور ہی انسانی زندگی کی فلاح کا ضامن ہے۔

دوسری بڑی حقیقت خود انسان ہے۔ انسان خدا کی ساری مخلوق میں امتیازی مرتبہ رکھتا ہے [۷]۔ اس کا منصب خدا کی عبادت یعنی پرستش و اطاعت ہے [۸]۔ وہ اگر صحیح روش پر چلے تو اس کے لیے خلافت و نیابت کا درجہ بلند ہے [۹]۔ اسے عقل و علم سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ ساتھ تمیزِ خیر و شر دی گئی ہے [۱۰]، بنابریں وہ ذمہ دار اور جوابدہ ہے [۱۱]۔

---

[۵] ملاحظہ ہو آیت: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱-۵۶)

[۶] ملاحظہ ہو آیت: رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا۔ (۲۰-۱۱۴)

[۷] ملاحظہ ہوں آیات: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ... (۱۷-۷) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵-۴)

[۸] ؍ ؍ : يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ... (۲-۲۱) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱-۵۶)

[۹] ملاحظہ ہو آیات: وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ... (۲۴-۵۵)

[۱۰] ملاحظہ ہو آیت: وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰-۱۰) [۱۱] ملاحظہ ہو آیت: أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا (۲۳-۱۱۵)

تیسری بڑی حقیقت مادّی کائنات ہے جو نامعلوم محرکات کے تحت کسی حادثے کے طور پر نہیں بن گئی، وہ رام لیلا یا کھیل تماشا نہیں ہے[12]۔ وہ بے مقصد و بے نتیجہ نہیں ہے[13]۔ اس کی ایک غایت ہے[14]۔ اس میں نظم و ترتیب ہے[15]۔ اس میں ہر چیز اٹل قوانین میں جکڑی ہوئی ہے[16]۔ اس میں توازن ہے[17] اور اس میں حسن و زیبائی ہے[18]۔ پوری کائنات ایک ہی کُل ہے جو ایک ہی قوت کے زیرِ فرمان چل رہی ہے[19]۔ اس کائنات کی تمام مادّی اشیاء اور قوتیں جن تک انسان کی دسترس ہو، اس کے لیے "متاع" کی حیثیت رکھتی ہیں[20] اور ان سے وہ بہ حیثیتِ نائبِ الٰہی فائدہ اٹھانے اور ان کو حدود اللہ کے اندر رہ کر استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ کائنات مادی کے موجودات اور ان کی قوتوں سے کام لینے کے لیے ان کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اس علم کو حضورؐ نے علم ابدان قرار دیا ہے یعنی وہ علم جو مجسم موجودات ——— نامی و غیر نامی ——— اور ان کی قوتوں اور ان کے استعمالات سے بحث کرتے ہیں۔

ان سہ گانہ حقیقتوں کے درمیان سفر کرنے والے طالب علم کے سامنے حقائق کے دو بڑے دائرے

---

[12] ملاحظہ ہوں آیات: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱-۱۶) لَوْ اَرَدْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا، اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ (۲۱-۱۷)

[13] ملاحظہ ہو آیت: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳-۱۹۱)

[14] ملاحظہ ہو آیت: خلق السموات والارض بالحق (۶۴-۳، ۱۶-۳)

[15] ملاحظہ ہو آیت: هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (۶۷-۳)

[16] ملاحظہ ہو آیت: .... مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ (۱۶-۱۲)

[17] ملاحظہ ہو آیت: وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (۵۵-۷)

[18] ملاحظہ ہوں آیات: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا .... (۱۸-۷) اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ (۳۷-۶) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ (۱۵-۱۶) حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ .... (۱۰-۱۰)

[19] ملاحظہ ہوں آیات: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (۲۱-۲۲) نیز قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا۔ (۱۷-۴۲)

[20] ملاحظہ ہو آیت: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۳-۱۴) وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۲-۳۶، ۷-۲۴)

آتے ہیں۔ ایک ظواہر و محسوسات کا دائرہ، دوسرا امورِ غیب[۱] کا دائرہ۔ امورِ غیب محسوسات کے پردے کے پیچھے ہیں اور اُن تک براہِ راست رسائی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہمیں نہیں دیا گیا لیکن ہم امورِ غیب سے بالکل بے نیاز ہو کر بھی نہیں چل سکتے۔ ہر فردِ انسانی چند نمایاں سوالات سے دوچار رہتا ہے کہ آیا کوئی خالق و مالک ہے یا نہیں؟ یہ زندگی ایک وقتی ظہور رہے یا اسے موت کے بعد بھی کسی شکل میں جاری رہنا ہے؟ ہم اپنے اعمال سے جو کچھ جیسے کچھ نتائج فوری طور پر پا لیتے ہیں بس معاملہ ان ہی پر ختم ہے یا کسی باقاعدہ قانون کے تحت عدل و انصاف کے مطابق ان کے صحیح اور مکمل نتائج ملنے ہیں؟ زندگی کا معاشی اور

---

[۱] امورِ غیب کی کئی اقسام ہیں۔ مثلاً:

ایک وہ تمام امور جو ماضی و مستقبل کے دائرے میں پائے جاتے ہیں۔ نیز ایسے دُور رس اور وسیع الاثر قوانین و عوامل جو صدہا تاریخی واقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ پھر اخلاقی و تمدنی سلسلۂ اسباب و علل کے وہ بے حساب اور ناقابلِ استقصا نتائج جو ہزارہا اشخاص سے ہوتے ہوئے کئی نسلوں تک پھیلتے چلے جاتے ہیں اور بسا اوقات ان کا دائرہ وسعت عالمگیر ہوتا ہے۔ (واضح رہے کہ الہامی علم و ہدایت میں ایسے حقائق و امور کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے)۔

دوسرے وہ امور جو ایک وقت میں کسی کے لیے غیب ہیں، کسی کے لیے شہود۔ جیسے مری میں بیٹھے ہوتے ہم نہیں جانتے کہ اس لمحے لاہور کی مال روڈ یا کراچی کی بندرگاہ پر کیا ہو رہا ہے اور وہاں کون کون سے اشخاص موجود ہیں۔ یا مثلاً اس وقت کہاں کہاں بارش ہو رہی۔ یا مثلاً ایک آدمی ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر یہ جان چکا ہے کہ فلاں نام کی گاڑی کس جگہ کب آنے والی ہے اور اب کس مقام سے گزر رہی ہو گی، لیکن اس بارے میں دوسرے بے شمار لوگ لاعلم ہیں۔ یا مثلاً ایک شخص کسی خاص زبان یا علم و فن کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے بے شمار ایسے امور سے واقف ہوتا ہے جن کو دوسرے نہیں جانتے۔

تیسرے وہ امور جو ایک زمانے کے لوگوں کے لیے دائرہ غیب میں ہوتے ہیں اور دوسرے زمانے میں شہود بن جاتے ہیں جیسے ریڈیو، بجلی یا جوہری توانائی کا وجود، یا جیسے چاند کی حقیقت کے بہت سے گوشے جو خلائی جہازوں کے استعمال سے قبل نامعلوم تھے۔ یہ ساری اقسام ممکن الشہود غیب کی تعریف میں آتی ہیں۔

چوتھے وہ امور جنہیں ہم محض اشیا و حوادث کے علم کی ہزار وسعتوں کے بعد بھی براہِ راست نہیں جان سکتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹ پر)

جنسی کامرانیوں سے بلند تر بھی کوئی مقصد ہے؟ اِن سوالات کا جواب طے کیے بغیر زندگی کی سرگرمی حسن و خوبی سے جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ ہر شخص اثباتاً نہیں تو نفیاً، شعوری طور پر نہیں تو نیم شعوری طور پر، باقاعدہ استدلال سے نہیں تو ظن و تخمین سے اِن سوالات کے جوابات طے کرتا ہے اور پھر اس کی زندگی اس کے پسندیدہ جوابات کے مطابق کوئی نہج اختیار کرتی ہے۔

اِن اُمورِ غیب کے متعلق انبیاء وحی و الہام سے حاصل کردہ علم کو ہمارے سامنے رکھ کر کائنات اور تاریخ کے شواہد سے ثابت کر کے دکھاتے ہیں کہ الہامی رہنمائی کو پیش کرنے اور قبول کرنے والے ہی فلاح پاتے ہیں۔ (باقی)

(بقیہ حاشیہ صـ۲۸)

مثلاً خدا کی ہستی، سلسلۂ وحی و الہام، حیات بعد الموت وغیرہ۔

اپنی بحث میں اسی معنی میں ہم نے امورِ غیب کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

جماعتِ اسلامی کا تاریخی کردار

(عبدالحمید صدیقی)

[اس مضمون کی پہلی قسط انتخابات سے پہلے ترجمان القرآن جلد ۱۰۴، عدد ۴ میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں جماعت اسلامی نے اسلام کے معاشی نظام کے خدوخال واضح کرنے کے لیے جو کوشش کی ہے اس کا ذکر کیا گیا تھا۔ درجِ ذیل مضمون میں سیاسی میدان میں جماعت اسلامی کی خدمات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے]۔

جماعت اسلامی کی سیاسی خدمات کو صحیح طور پر جانچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے اُن حالات پر نگاہ ڈالی جائے جن میں جماعت نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ یُوں تو سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی شہادت کے بعد ہی، لیکن خاص طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد غیر ملکی حکمرانوں نے مسلم قوم کے ساتھ جو ظالمانہ طرزِ عمل اختیار کر رکھا تھا، اور اس اندوہناک صورتِ حال کو بدلنے کے لیے مسلمانوں کے بعض بہی خواہ انہیں جس راہ پر گامزن ہونے کا مشورہ دے رہے تھے اُس میں کسی انقلاب انگیز سیاسی شعور کے بیدار ہونے کے کوئی امکانات نہ تھے۔

انگریز کی سرپرستی میں جنم لینے والی انڈین نیشنل کانگرس آغاز میں جس نہج پر اور جس رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اُس میں مکمل آزادی کا تصوّر بھی نہ کیا جا سکتا تھا مگر مسلمانوں کی اِس جماعت میں شمولیت نے اسے ایک انقلابی جماعت بنا دیا۔ خصوصاً مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی وجہ سے اس جماعت میں غیر معمولی حرکت اور حرارت پیدا ہوئی۔ اس سے پورے ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو غیر معمولی تقویت پہنچی مگر اس تحریک میں ہندو اور مسلمان مختلف احساسات کے ساتھ شریک ہوئے۔ ہندوؤں کے لیے تو یہ محض بدیشی آقاؤں کی جگہ دیسی آقاؤں کی فرمانروائی کا مسئلہ تھا اور اس وجہ سے ان کے فکر و عمل کا محرّک مغرب کی جارحانہ قوم پرستی کا وہ فلسفہ تھا جو بیسویں صدی کے آغاز میں پوری دنیا

کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اس فلسفے کی رُو سے کسی قوم کا وطن کبریائی کے مقام پر فائز تھا اور اس میں الوہیت کی وہی شان پیدا کی جا چکی تھی جو معبودِ حقیقی میں ہوتی ہے۔ اُس دور کے ہندو مصنفین اور شعراء نے ہندوستان کی تعریف و توصیف اور اس کی محبت میں جو مضامین اور نظمیں لکھی ہیں اُن میں مغربی وطن پرستی اور قوم پرستی کی جھلک پوری طرح دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان کا قومی نغمہ بندے ماترم وطن کی خدائی کا ہر اعتبار سے عکس پیش کرتا ہے۔

مگر مسلمانوں کا معاملہ ہندوؤں سے بالکل مختلف تھا۔ جہاں تک وطن کی محبت اور غیر ملکی استعمار سے اس کی گلو خلاصی کی تڑپ کا تعلق تھا وہ ہندوستان کی دوسری اقوام سے کہیں آگے تھے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے میں انہوں نے کبھی تامل سے کام نہ لیا۔ چنانچہ جب تحریکِ آزادی نے زور پکڑا تو مسلمان فوراً سروں پر کفن باندھ کر میدان میں اُتر آئے اور انہوں نے استخلاصِ وطن کی خاطر ایسی قربانیاں دیں جن کی تاریخ میں بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ خصوصاً علماء نے انگریزی سامراج کا جس پامردی سے مقابلہ کیا اور اس کے تسلّط کو ختم کرنے کے لیے جس ہمت اور ایثار کا ثبوت دیا وہ تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

لیکن جب ہم آزادیٔ وطن کی ان کوششوں کا ذرا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ بات صاف طور پر دکھائی دیتی ہے کہ مسلم قوم اگرچہ تحریکِ آزادی میں تو پیش پیش تھی مگر وہ جس نظریہ اور احساس اور جس مقصد اور نصب العین کے حصول کی خاطر اس تحریک میں شریک تھی وہ ہندوؤں کے جذبہ و احساس اور آدرش سے بالکل مختلف تھا۔ ہندو تو اہلِ مغرب کے قوم پرستی کے نظریہ سے سرشار ہو کر انگریز کے خلاف محض اس لیے صف آرا تھا کہ ہندوستان پر ایک غیر ملکی قوم نے غلبہ حاصل کر رکھا تھا اور وہ اس ملک کے وسائل کو بڑی بے دردی کے ساتھ لوٹ رہی تھی۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ صورتِ حال بھی اگرچہ ناقابلِ برداشت تھی کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کی آزادی سلب کر کے اُسے غلام بنائے اور اُس کے وسائل کا استحصال کرے مگر تحریکِ آزادی میں اُن کی شرکت کا محرّک اس سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ مقصد تھا۔ وہ انگریزی تسلّط کے اس وجہ سے خلاف تھے کہ اُن کی نظر میں انسان پر انسان کی خدائی بنیادی طور پر غلط اور باطل ہے۔ انسان صرف اُس خالق اور مالک کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے جو اس پوری کائنات کا حاکم ہے۔ اس ایک حاکم کے علاوہ ہر دوسرے حاکم کی حاکمیت انسان کی تذلیل ہے۔ سروری صرف اسی ذات کے لیے ہمنا کو زیب دیتی ہے باقی سب جھوٹے خداؤں کی پرستش ہے۔ قدرتی طور پر مسلمانوں کے

دلوں میں تحریکِ آزادی میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے جہاں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ اس ملک سے انگریز کی خدائی ختم کی جائے وہاں یہ احساس بھی پوری شدت سے موجود تھا کہ اس خدائی کے خاتمے کے بعد کائنات کے حقیقی خالق اور مالک کی خدائی قائم کرنے کا التزام کیا جائے۔ فکر و نظر کے اس اساسی اختلاف اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو بالکل شروع ہی سے بھانپا جا سکتا ہے۔ جو لوگ تحریکِ آزادیِ وطن کی تاریخ پر نگاہ رکھتے ہیں وہ اس اختلاف کو ہر گام پر اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ ہندوؤں کے نزدیک آزادیِ وطن کا مقصد صرف اسی قدر تھا کہ بدیشی خداؤں کو یہاں سے نکال کر اُن کی جگہ دیسی خداؤں کو خدائی کے تخت پر متمکن کر دیا جائے، اور معاشی میدان میں آزاد ہندوستان کو غیر ملکی استحصال سے بچا لیا جائے۔ ان دو مقاصد کے علاوہ ہندوستان کی غیر مسلم اقوام کے سامنے آزادی کا کوئی دوسرا مقصد نہ تھا۔ مگر مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آزادی کے بعد جب دیسی خدا کبریائی کے مقام پر فائز ہوں گے اور اُن کی حاکمیت کا سکہ ملک میں ہر سُو چلے گا تو کیا اُن کے لیے دینی اعتبار سے یہ صورت گوارا ہو گی؟۔ یہ وہ مقام تھا جہاں مسلمانوں کے سوچنے کی راہیں دوسری اقوام سے بالکل مختلف ہو جاتیں۔ اُن کے لیے حاکمیتِ خداوندی کے سوا ہر دوسری حاکمیت باطل ہونے کی وجہ سے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہ تھی۔ اس لیے وہ تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کے ساتھ ساتھ اس نقشے کو بھی جاننے کے آرزومند تھے جس کے مطابق آزاد ہندوستان میں انہیں انسان کی خدائی سے نجات حاصل ہو گی اور وہ حاکمیتِ الٰہی کے تحت آرام اور سکون سے زندگی بسر کر سکیں گے۔

سیاسی میدان میں اختلاف کا دوسرا مظہر مسئلہ قومیت تھا۔ ہندوؤں کے ہاں مغرب کا تصور قومیت کافی حد تک سرایت کر چکا تھا اور وہ زبان کی حد تک یہ تسلیم کر چکے تھے کہ قومیت کا خمیر خاکِ وطن سے اٹھایا جاتا ہے اور وہ سارے باشندے جو ایک وطن کے اندر بستے ہیں وہ قومیت کے رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے قومیت کا یہ تصور اُن کے مذہبی تصورات سے مغائرت رکھتا ہے۔ اسلامی قومیت کی بنیاد عقیدے کا اشتراک ہے۔ اس لیے یہ قومیت کبھی بھی وطن، رنگ اور نسل کی تنگ پہنائیوں میں اپنے آپ کو محبوس نہیں کر سکتی۔ اس کا مزاج بین الاقوامی ہے اور اس کا دائرہ پوری انسانیت پر محیط ہے۔ جو شخص بھی، خواہ وہ کسی وطن کا باشندہ ہو، کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، وہ خواہ کوئی زبان بھی بولتا ہو اور کسی رنگ کا بھی ہو اگر وہ کلمہ طیبہ کو اس کے مقتضیات کے ساتھ قبول

کر لیتا ہے تو وہ اسلامی برادری کا رکن بن جاتا ہے اور اس میں اُس کا مرتبہ و مقام دنیوی جاہ و جلال سے متعین نہیں ہوتا بلکہ نیکی، پاکبازی، خدا خوفی اور پرہیزگاری کی بنیاد پر متعین ہوتا ہے۔ قومیت کا یہ تصور تو دنیا کی دوسری اقوام کے لیے بھی بالکل نرالا ہے مگر اسے وہ قوم آخر کس طرح ہمدردی کے جذبات کے ساتھ سمجھ سکتی ہے جس نے اپنی قوم کے اندر ذات پاک کی صورت میں ہزاروں قید خانے بنا رکھے ہیں اور اُن کے اندر اپنے آپ کو بند کرنے ہی میں اپنی عافیت اور اپنا کمال سمجھتی ہے۔ جہاں تک ہندوؤں کے ابنائے وطن ہونے کا تعلق ہے مسلمان اُن کے لیے عزت و احترام کے وہی جذبات رکھتے تھے جو ایک شریف شہری کے دوسرے شریف اور امن پسند شہری کے لیے ہونے چاہییں۔ وہ ان کے دکھ درد میں بھی شریک ہونا چاہتے تھے مگر اُن کے لیے قومیت کی کوئی ایسی شکل گوارا نہ تھی جو اُن کے مذہبی معتقدات سے متصادم ہو۔ وہ دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ رشتۂ اخوت کو اس لیے توڑنے پر تیار نہ تھے اور نہ ہو سکتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان سے باہر کسی دوسرے وطن میں جنم لیا ہے۔

وطن اور قوم کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اساسی تصورات میں اختلاف کا ادراک تحریکِ آزادی کے بالکل ابتدائی ایام میں بھی کیا جا سکتا تھا اور اس کے لیے ناقابلِ تردید ثبوت بھی فراہم کیے جا سکتے ہیں لیکن اس بات کی تصدیق کے لیے کہ ہندوؤں نے مغربی نیشنلزم کے زیر اثر یہ جدوجہد شروع کی اور مسلمانوں نے دینی تقاضوں کے تحت اس فرض کو سر انجام دینے کی کوشش کی یہ بات کافی ہے کہ ہندوؤں کے ہاں اس تحریک میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جنھوں نے مغربی طرز کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندوؤں کے مذہبی طبقے بالعموم اس تحریک سے الگ تھلگ رہے مگر مسلمانوں میں مذہبی طبقے نے اس میدان میں سب سے زیادہ قربانیاں دیں۔ آزادیٔ وطن کے لیے جن لوگوں کو جان و مال سے محروم ہونا پڑا، یا جنھیں اس راہ میں ناقابلِ بیان مصائب و شدائد سہنے پڑے اُن کی اگر فہرست تیار کی جائے تو "ملا" کی تعداد یقیناً سب سے زیادہ نکلے گی۔ اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک انسان پر انسان کی خدائی کا خاتمہ ایک مذہبی فریضہ ہے جسے بہر طور ادا کرنا چاہیے۔

گذشتہ پچاس سال میں مسلمان خواہ آزادیٔ وطن کی کسی تحریک سے وابستہ رہے ہوں مگر اُن کے عمل کا محرک صرف یہی ایک احساس تھا کہ انھیں آزاد ہندوستان میں ایسے حالات میسر آ جائیں جن میں وہ خدا کی حاکمیت کے تحت اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ بعض تحریکوں کے مزاج کو سمجھنے اور اُن کے

چھپے ہوئے عزائم کو جاننے میں تو غلطی ہوسکتی ہے اور اس معاملے میں ملت کے بعض سربراہوں سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے مگر اس معاملے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے نزدیک آزادیِ وطن آخری منزل نہ تھی بلکہ حصولِ منزل کا بالکل ابتدائی مرحلہ تھی۔ اُن کے پیشِ نظر آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ تین کام بڑے اہم تھے:

(ا) انہیں ہر مرحلے پر یہ فکر دامنگیر رہتی کہ مسلم قوم جس دینی احساس کے تحت استخلاصِ وطن کی تحریک میں شامل ہے وہ احساس نہ صرف زندہ رہے بلکہ اُس میں غیر معمولی اضافہ ہو کیونکہ اس احساس کے مضمحل ہونے سے مسلم قوم کے اندر اضمحلال پیدا ہونا بالکل ناگزیر ہے۔ ان کے اس خدشے کے متعدد وجوہ تھے جن میں سب سے بڑی وجہ باطل افکار و نظریات کا وہ خوفناک طوفان تھا جو مغربی استعمار کے ساتھ ہی اس سرزمین پر اُمڈ پڑا تھا۔ مغربی تعلیم مسلمانوں کی نوخیز نسلوں کو دین سے برگشتہ کر رہی تھی۔ پھر ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں جو غیر مسلم شامل تھے اُن کی بہت بڑی تعداد مذہب کی مخالف یا اُس سے لاتعلق اور مغربی نظریات کی دل و جان سے شیدائی تھی۔ ان حالات میں اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ کہیں یہ طوفان مسلمانوں خصوصاً نوجوانوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر نہ لے جائے اور وہ وطن کو آزاد کرانے کرانے اپنے دین اور اپنے ایمان سے نہ ہاتھ دھو بیٹھیں۔ یہ خدشہ کچھ اس بنا پر بھی شدید تھا کہ اس تحریک میں جو غیر مسلم انقلابی ہونے کی بنا پر عوام میں مقبول تھے اور اس تحریک کی روحِ رواں خیال کیے جاتے تھے وہ نہ صرف مغربی نیشنلزم کے علمبردار تھے بلکہ کمیونسٹ بھی تھے اور اپنے الحاد پر علانیہ فخر کیا کرتے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے دینی احساسات کو بچانے کا کام بھی انتہائی ضروری تھا۔

(ب) دوسرے اس بات کی بھی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ دینی جذبے کو برقرار رکھنے کے لیے اُسے علمی بنیاد فراہم کرنا بالکل ناگزیر ہے۔ محض جذبہ خواہ وہ کتنا ہی صادق ہو، زندہ رہنے کے لیے شعور کا محتاج ہے۔ اگر محض اندھے جذبات پر دنیا ہمیشہ کے لیے قائم رہ سکتی تو اوہام کے بلبلے کبھی نہ ٹوٹتے بلکہ انہیں بھی اسی طرح بقا نصیب ہوتی جس طرح کہ حقائق اور سچائیوں کو حاصل ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جس جذبے کو ذہن سہارا نہیں دیتا یا جس احساس کی آبیاری علم کے چشمے سے نہیں ہوتی وہ جذبہ احساس جلد ہی افسردہ ہوکر مرجاتا ہے۔

(ج) تیسرے مسلمانوں کے بہی خواہوں کے سامنے یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ اُمت کے سامنے احیاءِ دین

کا جو مقدس نصب العین پیش کیا جا رہا ہے اس کے عملی مضمرات کیا ہیں کیونکہ استخلاصِ وطن کے فوراً بعد پہلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ اب اس ملک کی تعمیرِ نو اسلامی تعلیمات کے مطابق کس طرح کی جائے اور اس راہ کی عملی دشواریوں کو کن کن طریقوں سے حل کیا جائے۔ اِس نوعیت کے سوالات آزادی سے بہت پہلے ہی ذہنوں میں پیدا ہونے شروع ہو چکے تھے، خصوصاً نوجوان نسلیں اسلام کے سیاسی نظام اور اسلام کے معاشرتی نظام اور اسلام کے معاشی نظام کی تفصیلات سمجھنے کی شدید آرزومند تھیں۔ اور وہ دورِ حاضر میں ایک صحیح اسلامی ریاست کے خدوخال کو جاننے کے لیے بیتاب نظر آتی تھیں۔

اِن سارے مسائل اور حالات کو سامنے رکھ کر اگر جماعت اسلامی کے تاریخی کردار کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات کسی جذبۂ فخر کی بنا پر نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر کہی جا سکتی ہے کہ جماعت نے اس سلسلے میں فکر و عمل کے دونوں میدانوں میں عظیم خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ اُن کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۱) مولانا مودودی کی چار کتابیں یعنی مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ اوّل، دوم، سوم اور مسئلہ قومیت ہماری ملی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولانا کی ان بیش قیمت تحریروں نے نہ صرف مسلمانوں کے دینی احساسات کو قوت و توانائی بخشی بلکہ انہیں ٹھوس علمی اور فکری بنیادیں فراہم کر کے اُن کے اندر استحکام پیدا کیا۔ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ اوّل میں مولانا نے مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو بیدار کیا اور انہیں بتایا کہ آزادیٔ وطن بلاشبہ ایک نیک مقصد ہے مگر مسلمان کے نزدیک یہ مقصد ثانوی حیثیت رکھتا ہے، اس کی حیثیت تدبیرِ منزل کی سی ہے، منزل کی نہیں۔ اس کی زندگی کا اصل مقصد اِس سے کہیں زیادہ بلند اور ارفع و اعلیٰ ہے۔ اُسے صرف ہندوستان کے باشندوں کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اسے پوری انسانیت پر سے انسان کی خدائی کو ختم کرنے کا فرض سونپا گیا ہے۔

اس کتاب میں مولانا نے "اسلام ایک جامع تہذیب کی حیثیت سے" جو فکر انگیز مقالہ لکھا ہے اُس کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس نے فکر و نظر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ مسلمانوں کے ہاں یہ احساس بلاشبہ پہلے سے موجود تھا کہ اُن کا دین صرف زندگی کے ایک گوشے تک محدود نہیں بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہے لیکن اِس تصور کے جو عملی مضمرات و مقتضیات تھے وہ اُس

مضمون سے واضح ہوتے اور اُن کے اندر اس بات کا شعور بیدار ہوا ہے کہ آزادیٔ وطن کی تحریک میں انہیں کن احساسات کے ساتھ شریک ہونا چاہیے۔ اس کتاب نے مسلمانوں کے دل و دماغ کو پوری قوت سے جھنجھوڑا اور انہیں اپنے اصل فرائض اور مرتبہ و مقام سے آگاہ کیا۔ مسلمانوں کو خود آگاہی کا درس دینے میں اس کتاب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ پھر اس کتاب سے مسلمانوں کے دل و دماغ میں ابنائے وطن کے ساتھ اختلافات کے وہ واضح نقوش بھی اُبھرنے لگے جنہیں وہ پہلے تحت الشعور میں محسوس کرتے تھے مگر وہ انہیں شعور کی سطح پر سمجھنے سے قاصر تھے۔ آزادیٔ وطن کے دل و جان سے خواہشمند ہونے کے باوجود وہ وطنی تحریک میں کھل کر شامل ہونے میں متامل نظر آتے۔ ہندو مسلمانوں کے اس طرزِ عمل پر طعنہ زنی کرتا اور اسے استعمار پسندی اور غلامانہ ذہنیت پر محمول کر کے اسے رُسوا اور ذلیل کرتا اور دُنیا کو یہ تاثر دیتا کہ ہندوستان کا مسلمان اب غلامی پر راضی ہو چکا ہے اور وہ اس غلامی کے بدلے انگریزی سامراج سے دنیوی فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ دنیا کے لیے یہ ایک معمہ تھا کہ مسلمان دوسرے اقوام کے مقابلے میں کہیں زیادہ حُریت پسند ہونے اور اس راہ میں اُن سے کہیں زیادہ ایثار کرنے کے باوجود سامراجیوں کے ایجنٹ ہونے کا طعنہ سُن رہے ہیں اور جن لوگوں کو مسلمانوں نے تصورِ آزادی سے آشنا کیا وہ حُریت پسندی کے دعوے دار بنے بیٹھے ہیں۔ مولانا کی اس کتاب نے شکوک و شبہات کے خلفشے کانٹے تھے انہیں نکال دیا اور علمی تجزیہ کے ساتھ بتایا کہ آزادیٔ وطن کی یہ تحریک جن عناصر سے عبارت اور جس مزاج کی حامل ہے اور جن مقاصد کے حصول کے لیے آگے بڑھ رہی ہے اُن کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن کے ساتھ مسلمان ذہنی طور پر مطابقت پیدا نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کی دوسری اقوام چونکہ مذہب کا کوئی ایسا جامع تصور نہیں رکھتیں جو زندگی کے سارے گوشوں پر محیط ہو اس لیے انہیں حصولِ آزادی کے بعد تعمیرِ نَو کا ہر وہ نقشہ قابلِ قبول ہے جس سے ملک اور قوم کو مادّی لحاظ سے فائدہ ہو۔ اُن کے لیے استخلاصِ وطن کا مسئلہ صرف آقاؤں اور حکمرانوں کی تبدیلی کا مسئلہ ہے مگر مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ اور نازک ہے کیونکہ اس کا تعلق ان کے دین اور ایمان سے ہے۔ انہیں بلاشبہ وطن کی آزادی عزیز ہے اور اس معاملے میں وہ اپنے ہم وطنوں سے کسی لحاظ سے بھی پیچھے نہیں مگر وہ چونکہ ایک ایسے دین کے علمبردار ہیں جو حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں پر پوری طرح حاوی ہے اس لیے وہ اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا نہیں کر سکتے جو اُن کے دینی تصورات سے مغائرت رکھتی ہو

یا اُن سے متصادم ہو۔ اُن کے نزدیک یہ مباحث کہ وطن پہلے ہے یا دین پہلے، سرے سے بیکار مباحث ہیں کیونکہ مسلمان کی نظر میں دین زندگی میں صرف اوّلیت کا مقام ہی نہیں رکھتا بلکہ زندگی کے ہر گوشے اور قلب و دماغ کے ہر ریشے میں حکمرانی کا مقام رکھتا ہے اسے زندگی میں اس طرح تفوق اور برتری حاصل ہے کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہر دوسری چیز ہیچ اور بیکار ہے۔ مسلمان اوّل تا آخر اور سرتا پا مسلمان ہی ہے اور اس کے علاوہ اس کی کوئی دوسری حیثیت نہیں اور اسی حیثیت میں وہ ہر قول اور فعل کی قدر و قیمت متعین کرنے کا پابند ہے۔ اس کے نزدیک آزادی کی بھی اگر کوئی قدر و قیمت ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے حاصل ہونے سے کوئی قوم غیر ملکی حکمرانوں کی لوٹ کھسوٹ سے نجات حاصل کر لیتی ہے بلکہ اس کی قدر کی وجہ بھی صرف یہ ہے کہ خالق نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اس لیے کوئی انسان بھی دوسروں کو غلام بنانے کا مجاز نہیں۔ اُس پر صرف اپنے خالق کی بندگی واجب کی گئی ہے۔ اس ایک بندگی کے علاوہ وہ ہر دوسری بندگی سے انسان بالکل بے نیاز ہے۔

مولانا نے ایک طرف تو مسلمانوں کو اُن کے صحیح موقف اور اُن کے حقیقی نصب العین کو واضح کر کے انہیں اپنے اصل کام اور فرض سے آگاہ کیا اور دوسری طرف ہندوستان کی سب سے بڑی وطنی تحریک انڈین نیشنل کانگریس کے چہرے سے نقاب کشائی کر کے یہ بتایا کہ یہ صرف آزادئ وطن کی تحریک نہیں بلکہ بڑے جارحانہ عزائم لے کر آگے بڑھ رہی ہے۔ مغربی قوم پرستی کا نظریہ اس کے رگ و پے میں پیوست ہے۔ الحاد سے اس کا خمیر تیار ہوا ہے اس لیے مسلمانوں کے اساسی تخیلات سے اس کا تصادم بالکل ناگزیر ہے۔ مولانا کی یہ کتاب اتنی معرکۃ الآرا تھی کہ اس کے شائع ہوتے ہی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک تلاطم پیدا ہو گیا اور اُن پر بعض ایسے حقائق واضح ہوئے جنہیں وہ کبھی کبھی محسوس تو کرتے تھے مگر جن کا انہیں پوری طرح ادراک نہ تھا۔ اس کتاب نے یوں تو مسلمانوں کے سارے طبقوں کو متاثر کیا مگر خاص طور پر وہ حریت پسند طبقے بڑے متاثر ہوئے جو مسلمان کی حیثیت سے اس جنگِ آزادی میں شریک ہونا چاہتے تھے۔

پھر اس کتاب کا یہ اثر بھی دیکھنے میں آیا کہ مسلمانوں کے مختلف طبقے ایک دوسرے سے چھٹ کر الگ ہونے لگے۔ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو مغربی تصورات، الحاد اور اشتراکیت کو پوری طرح قبول کر چکا تھا اور محض نام کے اعتبار سے مسلمان رہ گیا تھا اس نے اپنی سرگرمیوں کے لیے الگ میدان تلاش کر لیا مگر وہ لوگ جنہیں اسلام دنیا کی ہر دوسری متاع سے عزیز تر تھا انہوں نے یا تو مختلف تحریکات کو چھوڑ کر اپنے

آپ کو جماعت اسلامی سے وابستہ کر لیا یا اگر اُن کے ساتھ رہے بھی تو اسلام کے معاملے میں زیادہ حساس اور چوکس ہو کر رہے اور اس بات کا برابر خیال کرتے رہے کہ جس قافلہ میں وہ شریک ہو کر چل رہے ہیں وہ انہیں اسلامی نقطۂ نظر سے بربادی کی طرف تو نہیں لے جا رہا۔ یہ اُن کے اس احساس کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی دینی سرگرمیوں میں اضافہ ہُوا تاکہ مختلف لادینی تحریکات نے جو زہر پھیلا رکھا تھا اُس کے اثرات کو زائل کرنے کا التزام کیا جائے۔

مولانا کی تحریروں سے پہلی بار مسلمانوں کو نیشنلزم کی تباہ کاریوں کا اندازہ ہُوا اور انہیں یہ معلوم ہُوا کہ اُن کا تصوّرِ قومیت مغرب کے اس جارحانہ تصوّر سے کس قدر مختلف ہے اور یہ تصورِ انسانیت کے لیے مغربی قوم پرستی کی ستم رانیوں کے مقابلے میں کس حد تک خیر و فلاح کا موجب ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے اشتراکیت کے خطرے کو اچھی طرح بھانپتے ہوئے مسلمانوں کو اس آنے والے طوفان سے متنبہ کیا اور بڑے ٹھوس دلائل اور شواہد سے ثابت کیا کہ یہ معاشی بدحالی کو دُور کرنے کا کوئی پروگرام نہیں جسے قبول کر لیا جائے بلکہ یہ ایک ملحدانہ تحریک ہے جو الحاد کو دنیا میں پُوری طرح مسلط کرنے کے لیے اٹھی ہے۔ یہ انسانیت کے خلاف ایک خوفناک سازش ہے۔ اس کے پھلنے پھولنے سے مذہبی اقدار تباہ ہوتی ہیں۔ اخلاق کی مٹی پلید ہوتی ہے اور دینی معتقدات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے پُوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کو یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ "معاشی اصلاح کا یہ پروگرام کسی ملک میں اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ مذہب کی پُوری طرح جان نہ نکل جائے، کیونکہ اُس کی زندگی اس کے لیے موت کا پیغام ہوتی ہے، اس لیے وہ سب سے پہلے مذہب کا خاتمہ کرتا ہے اور پھر اُس کی لاش پر اپنی بادشاہی کا تخت بچھاتا ہے، اگر اس لاش میں حرکت کرنے کی کوئی معمولی سی قوت بھی باقی رہے تو اشتراکیت کی حکمرانی قائم نہیں ہو سکتی۔"

(باقی)

رسائل و مسائل

نابالغ اولاد کا نان و نفقہ

سوال: مسلمانوں کی موجودہ سوسائٹی میں بہت سی خرابیاں موجود ہیں جن سے مظلوموں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ایک خرابی کے متعلق شریعت کی رہنمائی مطلوب ہے۔ اگر میاں بیوی میں ناچاقی کی بنا پر عورت کو طلاق ہو جائے اور شیرخوار یا چھوٹے بچے ہوں تو وہ ماں کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں مگر ان بچوں کے نان و نفقہ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ والد اس ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا اور بالعموم یہ بوجھ بیچاری ماں کے سر ڈال دیا جاتا ہے اس معاملے میں اسلامی قانون کیا ہے؟ والد بچوں کے اخراجات کا ذمہ دار ہے یا نہیں اور ہے تو کتنی مدت تک کے لیے ہے؟ اس بارے میں اگر حنفی مسلک معلوم ہو جائے تو بہتر ہے کیونکہ اکثریت یہاں اسی مسلک پر عامل ہے۔ اور اگر یہ معاملہ عدالت تک پہنچے تو عدالتیں بھی عام طور پر زوجین کے مذہب فقہی کا لحاظ رکھتی ہیں اور اسی کے مطابق فیصلے دیتی ہیں۔

قرآن و حدیث میں اس کے متعلق کوئی حکم و ہدایت ہو تو اس کا حوالہ بھی دے دیں تاکہ اس طرح کے گھریلو تنازعے گھر ہی میں نمٹائے جا سکیں۔

جواب: فقہائے حنفیہ کے فتوے کے مطابق زوجین کے مابین طلاق یا تفریق ہو جانے کی صورت میں اگر والدہ حقِ حضانت کو استعمال کرتے ہوئے اولادِ صغار اپنے پاس رکھے تو دورانِ حضانت بچوں کا نفقہ والد اور والد کی عدم موجودگی کی صورت میں والد کے ورثاء کے ذمے ہوگا۔ جہاں تک زمانۂ شیرخوارگی کا تعلق ہے، اس میں تو والدہ کا نان و نفقہ بھی والد ہی کے ذمے ہے اور یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۳۳ میں ہے:

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

(اور مائیں دُودھ پلائیں اپنے بچّوں کو پُورے دو سال اُس کے لیے جو رضاعت پُوری کرنا چاہتا ہو اور جس مرد کا بچّہ ہے اُس کے ذمّے ہے ماؤں کا کھانا کپڑا معروف دستور کے ساتھ)۔

اس آیت میں اگرچہ بچّوں کے بجائے ان کی والدہ کی خوراک و پوشاک کا ذکر ہے، لیکن یہ بات بالکل ظاھر ہے کہ جب دُودھ پلانے والی کا نفقہ و لباس والد کی ذمّہ داری ہے، تو حضانت کے دوران میں دُودھ پینے والے بچّے کا نفقہ بدرجۂ اولیٰ والد ہی کے ذمّے ہوگا۔ عورت جب اپنے اخراجات کی مکلّف نہیں ہے تو بچّے کے اخراجات کا بار اِس پر کیسے ڈالا جاسکتا ہے؟ پھر جب شیر خوارگی کی مدّت میں بچّے اور مُرضعہ دونوں کا نفقہ مرد پر واجب ہے تو یہ امر قرینِ قیاس و انصاف نہیں ہوسکتا کہ دُودھ چھڑانے کے بعد اگر بچّہ ماں کی حضانت میں رہے تو ماں اپنے نفقے کے ساتھ بچّے کی بھی ذمہ دار قرار دی جائے۔ والد کو قرآن خود مَوْلُوْدٌ لَّهٗ فرما رہا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اولاد دراصل باپ ہی کی ہے، اس لیے وہی اس کے مستقبل اور سُود و زیاں کا نگران اور ذمّہ دار ہونا چاہیے۔

ہدایہ، کتاب الطلاق، باب الولد من احق بہ (اولاد کا زیادہ حقدار کون ہے)، اس میں صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: والنفقة علی الاب (بچّے جو والدہ کے پاس ہوں گے ان کا نفقہ باپ پر ہے)۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں اس مقام کی تشریح کرتے ہوئے ابن الھُمام تحریر فرماتے ہیں:

ھذا ان کان حیًّا، فان کان میّتًا فعلی ذی الرحم الوارث علی قدر المواریث۔

(یہ نفقہ اگر والد زندہ ہو تو اس پر واجب ہے اور اگر مرجائے تو اس کے وارث رشتہ داروں پر بقدرِ وراثت واجب ہے)۔

آگے ہدایہ، باب النفقہ میں اسی بات کو دُہرایا گیا ہے۔ پہلے لکھتے ہیں:

ونفقة الاولاد الصغار علی الاب لا یُشارکه فیھا احد

(نابالغ اولاد کا نفقہ والد پر ہے۔ اس ذمّہ داری میں کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک نہیں)۔

آگے پھر فرماتے ہیں:

ونفقة الصغیر واجبة علی ابیه (اور چھوٹے بچّے کا نفقہ اس کے والد کے ذمّے ہے)۔

فقہائے احناف کا عام فتویٰ یہ ہے کہ والدہ کو لڑکے کے لیے سات برس تک اور لڑکی کے لیے نو برس تک حقِ حضانت حاصل ہے۔ اس مدت میں اگر وہ نکاحِ ثانی نہ کرے یا خاندان کے کسی ایسے مرد سے کرے جو اولاد نا شد کے لیے محرم ہو تو والدہ بچوں کو اپنی تحویل میں رکھنے کی زیادہ حقدار ہے۔ اس مدت کے بعد اگر والد مطالبہ کرے تو بچے واپس لے سکتا ہے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے رائج الوقت قوانین کے مطابق بھی دورانِ حضانت میں بچوں کے اخراجات کا ذمہ دار والد ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ تاہم اگر اس میں کوئی اختلاف و اشتباہ ہو، تب بھی اسلامی قانون کی تعبیر حنفی مسلک کی روشنی میں یہی ہے جو بالاختصار بیان کر دی گئی ہے۔

عذابِ قبر

سوال: میں اپنی دعاؤں میں عذابِ آخرت، عذابِ دوزخ اور عذابِ قبر سے پناہ مانگا کرتا ہوں۔ ایک صاحب جو منکرِ حدیث معلوم ہوتے ہیں انہوں نے میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ یہ عذابِ قبر تو کوئی چیز نہیں۔ محض مولویوں کی من گھڑت بات ہے۔ قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں اور جن حدیثوں میں اس کا ذکر ہے وہ غلط بلکہ یہود کی سازش ہیں کیونکہ خود ان میں بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عذابِ قبر سے بچنے کی دعا نہیں مانگتے تھے لیکن جب ایک یہودی عورت نے حضرت عائشہؓ سے بیان کیا کہ قبر میں عذاب ہوتا ہے اور انہوں نے آنحضورؐ سے اس کا ذکر کیا تب آپ نے عذابِ قبر کی دعا مانگنا شروع کر دی۔ یہ صاحب کہنے لگے کہ اگر عذابِ قبر واقعی ہوتا ہے تو اس کے لیے ذریعۂ معلومات بس ایک یہودن ہو سکتی تھی۔ اس کے متعلق کوئی ثبت واضح ثبوت بذریعۂ وحی ہونا چاہیے تھا۔

پھر وہ کہنے لگے کہ عذاب و ثواب کا فیصلہ تو قیامت سے پہلے نہیں ہو سکتا، پھر فیصلے سے پہلے عذاب کے کیا معنی؟ ایک شخص اگر قیامت سے لاکھ برس پہلے فوت ہوا اور دوسرا قیامت ہی کے روز مرا تو ایک کو گویا لاکھ سال زیادہ عذاب کا شکار ہونا پڑا پھر بے شمار قومیں اپنے مُردے دفن ہی نہیں کرتیں، ان کے لیے عذابِ قبر کہاں ہوگا؟ براہِ کرم ان سارے

سوالات و اعتراضات کا ایسا جواب دیں جن سے کم از کم میری اپنی حد تک تسلی ہو جائے۔

جواب: عذابِ قبر کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عذابِ قبر دراصل عذابِ برزخ ہے اور اس کا تعلق ہر حال میں زمین کے اُس گڑھے سے وابستہ نہیں ہے جس میں انسان دفن ہوتا ہے اسمیں شک نہیں کہ حدیث میں اس کے لیے عذابِ قبر ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن یہ اس لیے ہے کہ انسانی ذہن میں اور اس کے محاورۂ زبان میں قبر ہی وہ آخری منزل اور حدِ فاصل ہے جہاں یہ عالم ختم ہوتا ہے اور ایک دوسرے عالم کا آغاز ہوتا ہے۔ دوسرا عالم یعنی عالمِ برزخ درحقیقت روح کی زندگی ہے اور اس عالم میں جو واردات و کیفیات، عذاب و ثواب اور رنج و راحت کی طاری ہوتی ہیں، وہ روح ہی پر طاری ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ روح اس کیفیت کو اس طرح محسوس کرے جیسے کہ وہ روح اور جسم دونوں پر وارد ہو رہی ہے مگر اس کا اصل محور روح ہی ہوتی ہے۔ اس لیے جس مردے کو قبر نصیب نہ ہو وہ بھی بہرحال حیاتِ برزخی اور اس کے عذاب و ثواب سے مستثنیٰ نہ ہوگا اور ایک قبر میں یکے بعد دیگرے کئی لاشیں دفن ہوں، تب بھی ہر ایک کی برزخی زندگی الگ ہوگی یا دوسرے لفظوں میں ہر ایک اپنی ایک مختلف قبر میں جائے گا۔

عذابِ قبر، یعنی موت اور قیامت کے درمیانی وقفے کا عذاب بالکل حق ہے جو قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے اور کسی مسلمان کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ قرآن مجید سورۂ مومن، آیت ۴۵ میں یہ بیان ہے کہ قوم فرعون کے مردِ مومن کو اللہ نے فرعونیوں کی چالوں سے بچا لیا اور آلِ فرعون کو بدترین عذاب نے گھیر لیا۔ پھر اگلی آیت میں ارشاد ہے:

اَلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (آگ ہے جس کے سامنے وہ پیش کیے جاتے ہیں صبح و شام اور جس روز قیامت قائم ہوگی تو حکم ہوگا کہ آلِ فرعون کو سخت تر عذاب میں داخل کرو)۔

اِس آیت میں دو عذابوں کا الگ الگ ذکر ہے، ایک وہ جو قیامت سے پہلے وارد ہو رہا ہے اور دوسرا وہ جس میں فرعونیوں کے داخلے کا حکم قیامت کو ہوگا۔ پھر دونوں کی نوعیت اور باہمی فرق بھی واضح ہے۔ ایک عذاب ایسا ہے جو نسبتاً ہلکا ہے کیونکہ اس سے صبح شام آمنا سامنا کرایا جاتا ہے، دوسرا عذاب شدید تر ہوگا جب وہ سپردِ جہنم کر دیے جائیں گے۔ قبر کے سوال و جواب یا عذاب و ثواب کی جو تفصیلات حدیث میں آئی ہیں وہ اس آیت کے عین مطابق اور اس کی تشریح و توضیح ہیں، کیونکہ ان سے معلوم ہوتا

ہے کہ قبر میں جو کچھ پیش آتا ہے، وہ دراصل اس اچھے یا برے مستقبل کی تمہید ہے جو قیامت کے بعد پیش آنے والا ہے۔ انسان کو اس طرح معلوم و محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ کیسے انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔ برزخ اور قیامت کے عذاب کی اس وضاحت سے اس سوال و اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ فیصلے سے پہلے عذاب کے کیا معنی؟ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی جرم کے الزام میں ماخوذ ہو اس سے پولیس پوچھ گچھ اور احتساب بھی کرتی ہے، اُسے حوالات میں بھی بند کرتی ہے حالانکہ اس کا چالان ابھی عدالت میں برائے فیصلہ پیش نہیں ہوتا لیکن اس تواضع سے ملزم کو بہر حال یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ میں مجرم کی حیثیت سے پکڑا گیا ہوں۔ یہی نوعیت عذابِ قبر کی ہے۔

عذابِ قبر اور اس کی تفصیلات کا ثبوت متعدد احادیث سے ملتا ہے مگر منکرینِ حدیث کی یہ عجیب روش ہے کہ جو حدیث یا حدیث کا جو ٹکڑا ان کے اپنے مطلب کا ہو یا جس سے حدیث پر اعتراض یا انکار کی گنجائش ان کے نزدیک نکل سکتی ہو، اس کو تو یہ لوگ سرنامہ بنا کر پیش کرتے ہیں، مگر احادیث میں جو چیز ان کے موقف کا ابطال کرتی ہو، اس سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اب یہاں بھی یہی صورت ہے کہ انہوں نے یہودی عورت والا قصہ تو بیان کر دیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ اُس عورت کی بات سے حضرت عائشہؓ یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اثر نہیں لیا تھا اور نہ محض اس کے کہنے پر عذابِ قبر سے بچنے کی دعا شروع کی تھی۔ بلکہ احادیث میں صراحت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عذابِ قبر کی خبر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی دی تھی، اور اسی کی بنا پر آپ نے یہ دعا مانگی۔ اب جبکہ آنحضورؐ نے واضح فرما دیا کہ عذابِ قبر ہونے کی وحی مجھ پر نازل ہوئی ہے اور آپ نے اس کے لیے دعائے استعاذہ بھی کی ہے تو اس کے بعد جو شخص اس عقیدہ و عمل کا انکار و استہزاء کرتا ہے، اُسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔

عذابِ قبر کا بیان جن احادیث میں ہے، ان کی سند میں کوئی ضعف نہیں، بلکہ وہ نہایت صحیح الاسناد ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب استحباب التعوّذ من عذاب القبر میں ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے میرے پاس ایک یہودی عورت بیٹھی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ تمہیں معلوم ہے کہ قبر میں عذاب ہوتا ہے۔ یہ سن کر آنحضورؐ لرز گئے اور فرمایا کہ یہ عذاب یہود کو دیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ

کئی روز اس پر گزر گئے۔ پھر آنحضورؐ نے فرمایا، "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ پر وحی ہوئی ہے کہ تم لوگ قبر میں آزمائے جاؤ گے (تُفْتَنُوْنَ فِي الْقُبُوْرِ)۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اس کے بعد مَیں نے سُنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عذابِ قبر سے پناہ مانگتے تھے۔"

یہ حدیث مُسنَد احمد، مرویاتِ عائشہؓ اور دوسری کتبِ حدیث میں بھی موجود ہے۔

اب سوال میں جس طرح حدیث کے حوالے سے بات بیان کی گئی ہے، اس حدیث میں اس کے بالکل خلاف ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی عورت کے بیان کی بنا پر آنحضورؐ عذابِ قبر کے قائل نہیں ہوئے تھے بلکہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے مطلع کیا گیا تھا کہ قبروں میں (یعنی عالمِ برزخ میں) کفار و مومنین سب کی آزمائش ہوگی۔ جب آپؐ اللہ کے سچے نبی تھے اور آپ پر وحی بھی نازل ہوگئی تھی، تو پھر امورِ غیب کے معاملے میں آپ کو کسی یہودی عورت کے قول پر انحصار کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔

اب صرف ایک اعتراض باقی ہے کہ ایک شخص لاکھوں برس پہلے فوت ہوا اور دوسرا قیامت کے روز ہُوا، تو پہلا شخص زیادہ گھاٹے میں رہا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں زمان و مکان کے پیمانے اور ہیں اور عالمِ برزخ و عالمِ آخرت میں اور ہیں۔ وہ مختلف اشخاص کے لیے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جو شخص قیامت کے قریب فوت ہو اُسے ایک پل میں اس عذاب یا ثواب کا مزا چکھا دیا جائے جو لاکھ برس پہلے مرنے والے شخص کو قیامت تک دیا گیا ہے۔ خود اس دنیا میں نیند ایک ایسی حالت ہے کہ ہم ایک گھنٹہ سوتے ہیں مگر ہمیں ایسے خواب دکھائے جاتے ہیں جن میں ہم سالہا سال کی طویل زمانی مسافت طے کر لیتے ہیں۔ جسم کی قید میں رہتے ہوئے ہمارا شعور اگر ایسے تجربات سے آشنا ہو سکتا ہے، تو جو قادرِ مطلق روح اور جسم کے اتصال کو ختم کر سکتا ہے، وہ زمانی تقییدات کا خاتمہ کر کے ایک شخص کے ایک دن اور دوسرے شخص کے لاکھ سال کے طول و عرض کو مُساوی بنا سکتا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْر۔

فتاویٰ عالمگیریہ مترجم کی جزء ۱۴ بھی شائع ہو گئی

ناظم: محمد صادق سہگل آباد، ضلع جہلم

مطبوعات

ہمارے اقتصادیات | مصنف: السید محمد باقر الصدر مترجم علامہ سید ذیشان حیدر جوادی کراروی صفحات ۶۴۰ قیمت قسم اول پندرہ روپے، ناشر مکتبہ تعمیر ادب پوسٹ بکس ۲۴۵ لاہور۔

ہمارے اقتصادیات عربی کتاب "اقتصادنا" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں فاضل مصنف نے مارکس کے اصول معاشی، اشتراکیت، اشتمالیت اور سرمایہ داری نظام کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور ساتھ ہی اسلامی اقتصادیات کا ایک خاکہ بھی دیا ہے۔ اس تقابلی مطالعہ کے بعد دوسرے حصے میں اسلام کے اقتصادی نظام پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ابتدا میں جناب ذی شان حیدر نے "گفتارِ مترجم" کے عنوان سے اقتصادیات پر تقریباً سو صفحے کا ایک فکر انگیز مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ موصوف کا ترجمہ بھی رواں ہے۔

فاضل مصنف نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے بارے میں بڑی دیدہ وری سے بحث کی ہے اور بڑے وزنی دلائل کے ساتھ ان کی فکری لغزشوں کو بیان کیا ہے۔

یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ جناب سید محمد باقر الصدر موقت کے غالب نظامہائے معیشت میں کسی سے مرعوب و متاثر نظر نہیں آتے اور اسلام کے اقتصادی نظام کو سب سے ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہیں اور اس میں کسی پیوندکاری کے قائل نہیں ہیں۔

(۱) فاضل مصنف چونکہ ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل ہیں اس لیے اُن کا وہ نقطۂ نظر کتاب میں ہر مقام پر جھلکتا ہے۔ مثلاً جہاں کہیں بھی استدلال کا موقع آتا ہے وہ صرف حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی قول یا اُن کے حوالے سے کوئی اثر نقل کر دیتے ہیں۔ اس اندازِ بیان سے کتاب ایک محدود نقطۂ نظر کی حامل ہو کر رہ گئی ہے۔ آخر دوسرے ائمہ فقہاء نے بھی "اقتصادیات اسلام" کے موضوع پر بہت قابلِ قدر مواد پیش کیا ہے۔

مصنف کا جو نقطۂ نظر ہمارے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ مصنف اس بات کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ قرآن و سنت نے ہمیں کچھ معاشی اصول دیے ہیں جن کی روشنی میں اسلام کے اقتصادی نظام میں موجود خلا کو ہر دور کے تقاضوں کے مطابق پُر کیا جا سکتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اس خلا کو پُر کیا اس لیے آپؐ کے اعمال و افعال کی حیثیت دائمی قانون کی نہیں بلکہ وہ حکامِ وقت کے لیے نمونۂ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت و اہمیت بھی

(باقی ص۴۸ پر)

(بقیہ اشارات)

اس نظام کو اپناتی ہیں اُن کے اندر کچھ مدت کے لیے تو غیر معمولی حرکت اور حرارت پیدا ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ قوم اب دنیا پر چھا جانیوالی ہے مگر چونکہ کسی مادی نظام کے افق بڑے محدود اور اس کا دائرۂ کار بڑا تنگ ہوتا ہے اس لیے جلد ہی اس نظام کے اپنانے والوں میں افسردگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے طرزِ عمل میں اکتاہٹ نظر آنے لگتی ہے اس کے اندر بیزاری کا عام رجحان پرورش پاتا ہے جسے وہ شراب نوری یا دوسری نشیات کے استعمال کے ذریعے وقتی طور پر دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ دنیائے مغرب مال و دولت کی فراوانی کے باوجود جس مایوسی کا شکار ہے اُسے جانچنے کے لیے کسی لمبے چوڑے تجربے یا مشاہدے کی ضرورت نہیں اس کا اندازہ خود کشی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں اور بیزار انسانوں کی مجنونانہ حرکات سے بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

کسی مادی نظام کو مسلمانوں میں فروغ دینے سے پہلے یہ سوچیے کہ جس افسردگی کو ان کے اندر پیدا کیا جا رہا ہے۔ اس کی نوعیت کیا ہے۔ مادی نظام میں تو افسردگی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اس میں انسانی سرگرمیوں کی جولانگاہ بڑی تنگ اور محدود ہے۔ کیا یہ احساس ان لوگوں میں پرورش پاسکتا ہے جو روحانیت کی ناپیدا کنار وسعتوں سے آشنا ہوں۔ مادیت اگر قنوطیت کو جنم دیتی ہے تو روحانیت؛ رجائیت کی پرورش کرتی ہے۔

دوسرے اشتراکیت تو ان قوموں میں پھیلتی ہے جو سرمایہ داری سے بالکل مایوس ہو چکی ہیں مگر آخر یہ ان لوگوں میں کس طرح پھیل سکتی ہے جو اسلام کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ یہ اللہ کا بھیجا ہوا دین ہے جس میں دنیوی اور اُخروی فلاح کے حصول کی ساری تدابیر موجود ہیں۔ اور جسے اپنا کر انہوں نے ماضی میں بھی انسانیت کو فوز و فلاح سے ہمکنار کیا اور اب بھی اس کے اپنانے ہی سے وہ خود بھی اور پوری نوع بشری فلاح و کامرانی کی راہ پاسکتی ہے۔ مسلمان قوم کبھی بھی اپنے دین سے مایوس نہیں ہوئی، اسے اس دین پر غیر متزلزل یقین اور اعتماد ہے۔ وہ اس کی غیر معمولی برکات سے بھی پوری طرح واقف ہے۔ اور اس بات کا پختہ یقین رکھتی ہے کہ وہ اگر آج دنیا سے ناکام و نامراد ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اُسے اس دین سے نسبت ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے دین کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ ذہنی پس منظر کے اس عظیم اختلاف اور فکر و عمل کے اس غیر معمولی تفاوت کو نظر انداز کرتے ہوئے جو لوگ مسلمانوں کو اشتراکیت کی دعوت دیتے ہیں وہ اگر فاتر العقل نہیں تو عاقبت نا اندیش ضرور ہیں۔

تصحیح اغلاط

جو حضرات تفہیم القرآن جلد پنجم خرید چکے ہیں وہ براہِ کرم صفحہ ۵۸۴ پر درج کردہ غلطیوں کی اصلاح کرنے کے علاوہ حسبِ ذیل مزید غلطیوں کی اصلاح بھی فرمالیں :

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۸	۲۳	تسبیح کرتے رہے	تسبیح کرتے رہو
۵۰	۱۷	عذراب	عذرآب
۷۸	۶	امّت میں اور علم	امّت میں علم
۱۱۷	۲	صور پھونکا گیا	صور پھونکا گیا ہے
۱۳۷	۱۴	باز نہ آنے کی	باز آنے کی
۱۷۷	۱۹	چند ابتدا ابتدائی	چند ابتدائی
۱۹۲	۳	صَاحِبُکم	صَاحِبُکُمْ
۲۰۱	۲۰	ساتھ حاصر ہوگا	ساتھ حاضر ہوگا
۲۰۱	۲۴	ملالات	ملاقات
۲۷۸	۲۴	الذین اعطوا	الذین اذا اعطوا
۳۱۱	۳	بِسَوٗرٍ	بِسُوْرٍ
۳۴۴	۱۶	تحریم کا قال ہوگیا	تحریم کا قائل ہوگیا
۳۶۷	۲۰	فی ما اُوحیت الی	فی ما اَوحیت الی
۴۰۱	۲۴	غانیۃ المنتہیٰ	غایۃ المنتہیٰ

(باقی اگلے صفحہ پر)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۲۶	۲۴	اللہ تعالیٰ ے	اللہ تعالیٰ نے
۴۳۴	۲۰	جو شخص ہمارے	جو شخص ہمارے
۴۴۱	۴	اس معاملہ صحیح	اس معاملہ میں صحیح
۴۶۱	۱۴	راویات	روایات
۴۸۰	۱۳	و مسلم	وہ مسلم
〃	〃	خدا ترس	خدا ترسی
۴۸۲	۱۸	الگ زبانوں میں	الگ زمانوں میں
۴۹۶	۲۵	ابن ماجہ، بزاز	ابن ماجہ، بزار
۵۰۴	۲۳	نے بھی حضور	نے بھی حضور
۵۳۵	۵	یہ شخص	اس شخص نے
۵۳۸	آخری سطر	دوخ	دوزخ
۵۷۶	آخری سطر	(بخاری)، ری	(بخاری)۔ بخاری

(بقیہ مطبوعات) محسوس کی گئی ہے صفحہ ۳۷ مصنف کا یہ نظریہ کسی طرح بھی صحیح نہیں اور اگر اسے قبول کر لیا جائے تو شریعت کا پورا ڈھانچہ وقتی تقاضوں کے تابع قرار پاتا ہے۔ قرآن و سنت سے ہمیں جو ہدایات ملی ہیں اُن کی حیثیت وقتی اور ہنگامی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ اُن کی روشنی میں نئے نئے مسائل کے بارے میں اجتہاد تو کیا جا سکتا ہے مگر جن معاملات کو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے طے کر دیا ہے یا شریعت کا جو ڈھانچہ انہوں نے انسان کی ہدایات اور رہنمائی کے لیے دیا ہے وہ وقتی تقاضوں کے تحت تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ زیر تبصرہ کتاب کا انداز بیان بلاشبہ علمی ہے مگر افسوس کہ خشک بھی ہے پھر اس میں تحقیقی مباحث بہت طویل ہو گئے ہیں۔ اس کا دائرہ افادیت کافی وسیع ہو سکتا ہے اگر نسبتاً آسان زبان میں اس کی تلخیص شائع کر دی جائے۔

بحیثیت مجموعی "ہمارے اقتصادیات" ایک مفید کتاب ہے اور اپنے علمی مواد اور کثرتِ معلومات کے لحاظ سے اردو کے "اقتصادی لٹریچر" میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ طباعت کا معیار اچھا ہے۔ البتہ پروف پڑھنے کا کام اُس احتیاط سے نہیں کیا گیا جس کی کہ اس نوعیت کی علمی کتب تقاضا کرتی ہیں۔

کتابیں

اچھی بھی ہوتی ہیں اور بری بھی

آپ اچھی کتابیں پڑھیں

کیونکہ

آپ کو خود اچھا بننا ہے

اور دوسروں کو اچھا بنانا ہے

اچھی اچھی کتابوں کا مرکز

مکتبہ الخیر : ۴۰- اردو بازار لاہور

ضروری اعلان

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن جلد پنجم کے علاوہ پہلی چاروں جلدیں بھی ہمارے درج ذیل ایجنٹ حضرات سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

۱۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکٹ لاہور

۲۔ مکتبہ تعمیر انسانیت موچی دروازہ گوجر گلی لاہور

۳۔ مکتبہ الخیر اردو بازار۔ لاہور

۴۔ خان محمد ربانی، مکتبہ احیاء ملت کپ بازار، ملتان

۵۔ مکتبہ افکار اسلامی ۹۶/۱۱ بازار تلواڑاں راولپنڈی شہر

۶۔ مکتبہ دار الادب بک سیلرز اینڈ سٹیشنرز لیاقت سٹریٹ پشاور کینٹ

۷۔ عبدالرحمٰن شاہ خطیب جامع مسجد غزنی خیلاں شہر بنوں

۸۔ میسرز ایجنسی تاج کمپنی لمیٹڈ بندر روڈ، کراچی

۹۔ نوری پبلیکیشنز، لیاقت آباد، کراچی

۱۰۔ میسرز ریونا میڈ بک سیلرز اینڈ سٹیشنرز اردو بازار کراچی

۱۱۔ فیض احمد صاحب سہیل بک ڈپو سرگودھا

۱۲۔ شیخ سنز اردو منزل اردو بازار، کراچی

۱۳۔ رحمان نیوز ایجنسی شارع فاطمہ جناح کوئٹہ

۱۴۔ پنجاب نیوز ایجنسی بک سیلرز اینڈ نیوز پیپر ایجنٹس اردو بازار، کراچی

۱۵۔ شیر خان تاجر کتب میٹھا رام بلڈنگ اوڈرام روڈ پاکستان چوک، کراچی

۱۶۔ پاکستان بک ڈپو، صدر، راولپنڈی

۱۷۔ ملت بک ڈپو، ریلوے روڈ رحیم یار خاں

۱۸۔ ناظم مکتبہ تعمیر افکار اسلامی، علاقہ شمالی 5/15/D ۴ حکیم ابن سینا روڈ ناظم آباد کراچی

۱۹۔ ناظم مکتبہ چراغ راہ یوسف منزل ہرموس جی سٹریٹ کراچی

۲۰۔ مکتبہ اسلامی کورٹ روڈ حیدر آباد سندھ

۲۱۔ شیخ سعید احمد صاحب خاکٹ مارکیٹ فاروق جنرل سٹور ڈیرہ غازیخاں

از ناظم ادارہ "ترجمان القرآن"۔ اچھرہ، لاہور